اُردو نثر کی داستان

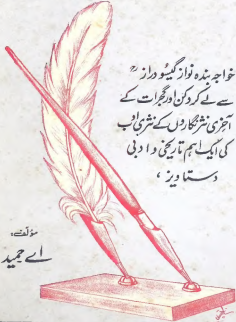

خواجہ بندہ نواز گیسو دراز ؒ
سے لے کر دکن اور گجرات کے
آخری نثر نگاروں کے نثری ادب
کی ایک اہم تاریخی و ادبی
دستاویز ،

مؤلف :
اے حمید

1
روشن کتابیں

مطبوعات شیخ غلام علی، ادبی مارکیٹ، چوک انار کلی ، لاہور

اُردو زبان و ادب کے شائقین کے لیے روشن کتابوں کی
ایک خصوصی پیش کش
اُردو نثر کا ایک مستند تاریخی و ادبی سلسلہ

اُردُو نثر کی داستان

(خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ سے لے کر دکن اور گجرات کے
آخری نثر نگاروں کے نثری ادب کی اہم تاریخی و ادبی دستاویز)

مؤلف:
اے۔ حمید

روشن کتابیں

مطبوعات شیخ غلام علی، ادبی مارکیٹ، چوک انار کلی، لاہور

دنیا کی ہر قومی اور علاقائی
زبان کی روشن کتابوں کا انتخاب

نگران : شیخ نیاز احمد
مُدیرِ مسئول : ارشد نیاز
مُدیر : رب نواز ملک

مجلسِ مشاورت :
اے حمید - ایم ایس ناز
محمد حنیف شاہد - عینکاف خالد

طابع : شیخ نیاز احمد
مطبع : غلام علی پبلشرز، لاہور

ادارہ :
مطبوعاتِ شیخ غلام علی
اُردو بازار - چوک - انارکلی - لاہور
ٹیلیفون نمبر
۵۲۹۰۸ ۶۱۸۵۹ ۲۱۳۰۲۰

تار :
کتاب مَن (KITABMAN) لاہور

پیارے قارئین !

روشن کتابوں کا دائرۂ کار اور وسیع ہو رہا ہے۔ پہلے ہم پورے مہینے میں صرف چار کتابیں آپ کی خدمت میں پیش کر رہے تھے لیکن اب ہم نے اپنے پروگرام میں مزید دو کتب کا اضافہ کر دیا ہے۔ ایک مہینے میں چھ کتابیں ـــ ترقی کی جانب ایک اَور قدم - اور ابھی تو

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں

ہر مہینے کی یکم، دس اور بیس تاریخ کو ہم دو، دو روشن کتابوں کا تحفہ لیے آپ سے ملاقات کیا کریں گے۔ اِن روشن کتابوں میں، اُردو نثر کی داستان، مُسلم شخصیات کا انسائیکلوپیڈیا (تاریخ اسلام کے آئینے میں) اور اُردو شعر کی داستان بھی شامل ہوگی ـــ یہ تینوں کتابیں قسط وار ہوں گی۔

قارئین ! یقین جانیے اتنے بڑے منصوبے کے متعلق سوچنا اور پھر اُسے عملی صورت دینا اتنا آسان کام نہیں ہے لیکن علم و ادب کی خدمت کا جذبہ دل میں ہو اور صاحبِ علم حضرات کا مخلصانہ تعاون ساتھ ہو تو بڑے بڑے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کی کوئی نہ کوئی صورت نکل ہی آتی ہے۔

اس وقت ہم "اُردو نثر کی داستان" کی پہلی قسط آپ کی نذر کر رہے ہیں۔ آج تک آپ جناب اے۔ حمید کو ایک خوبصورت افسانہ نگار اور ناول نگار کی حیثیت سے جانتے آئے ہیں۔ اُن کے کتنے ہی افسانے اور ناول ایسے ہیں جو قارئین کے لیے 'حدیثِ دل' کا درجہ رکھتے ہیں۔ لیکن آج اے حمید ایک محقق کے رُوپ میں جلوہ گر ہو رہے ہیں۔ بات کیسی اور کتنی ہی پُرانی کیوں نہ ہو۔ اے حمید کے قلم پر آ کر ایک خوش رنگ اور خوبصورت لبادہ اوڑھ لیتی ہے۔ اُردو نثر کی داستان میں انھوں نے پُرانے اور نئے رنگوں کو یکجا کیا ہے۔ بکھرے رنگوں کو سمیٹا جائے تو قوسِ قزح لگتے ہیں۔ 'اُردو نثر کی داستان' ایسی ہی ایک قوسِ قزح ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اے حمید نے اس تاریخی اور اَدبی سلسلے پر ہاتھ ڈال کر یقیناً وقت کی اہم ضرورت کو پُورا کیا ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں خواجہ بندہ نواز گیسو دراز سے لے کر دکن اور گجرات کے آخری نثر نگاروں تک کے حالات کا مستند تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ مستند الثبوت حوالوں اور تاریخی شواہد کی روشنی میں روشن کتابوں کا یہ نیا سلسلہ انشاء اللہ ایک تاریخی اور قیمتی ادبی دستاویز ثابت ہوگا اور اُردو زبان و ادب کے طلباء کے لیے بے حد مفید رہے گا۔

آئندہ اسی سلسلے کی جو دوسری کتاب پیش کی جا رہی ہے۔ اس میں مصر و یونان کے قصہ گویوں سے چل کر گولکنڈہ اور بیجاپور کے داستان گویوں تک کے حالات کا ذکر ہوگا۔

قارئین ! اب آپ کتاب کا مطالعہ کیجیے ـــ اور ہاں "روشن کتابوں" کے اس نئے سلسلے کے بارے میں ہمیں اپنی رائے سے ضرور نوازیے گا۔ شکریہ !

نیاز احمد

فہرست

عنوان	صفحہ
حرفِ آغاز، اردو زبان کی ابتدا	۳
دکھنی اردو	۷
دکن کی بہمنی سلطنت	۸
دکنی نثر کے مقتدر بزرگ	۸
نمونہ عبارت	۸
خواجہ بندہ نواز کی نظم	۹
صدرالدین صوفی، نظامی	۱۰
ملک الشعرا آذری	۱۱
اردو پر عربی کا اثر	۱۲
اردو پر عربی قواعد کا اثر	۱۳
قدیم ہندوستان کی بھاشا	۱۴
بزرگانِ دین اور اردو	۱۵
حضرت خواجہ بوعلی قلندر پانی پتی	۱۵
حضرت نظام الدین اولیاؒ	۱۵
حضرت امیر خسرو، حضرت مخدوم علاءالدین علی احمد صابر	۱۶
حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ (۱۳۸۰)، اردو کی پہلی نثری تصنیف	۱۶
دکن میں اردو کی ابتدا ۱۲ سو عیسوی	۱۷
اردو کی ابتدا گجرات میں سنہ ۱۲۹۷ء	۱۷
اردو کی قبولیت سنہ ۱۳۲۳ء	۱۷
دکن کے اولین نثر لکھنے والے (۱۴۰۹ء)	۱۸
کبیر داس (۱۴۴۰ء)	۱۸
گورو نانک جی (۱۴۶۹ء)	۱۸
مغل سلطنت کا قیام (۱۴۸۳ء)	۱۸
تلسی داس (۱۵۲۶ء)، سور داس	۱۹
مرزا عبدالقادر بیدل (۱۷۲۱ء) نوری اعظم پوری (۱۵۵۶ء)	۲۰
حضرت کمال الدین مخدوم شیخ (۱۵۹۳ء)	۲۰
پنڈت چندر بھان (۱۶۶۲ء)، محمد افضل (۱۶۲۵ء)	۲۰
معزالدین موسوی خان فطرت (۱۷۹۰ء)	۲۰
جعفر زٹلی (۱۶۵۹ء)	۲۱
قبول کشمیری (۱۷۲۶ء)	۲۱
مرزا قزلباش امید (۱۷۴۶ء)	۲۱
اردو نثر کا پہلا عہد	۲۲
دکن میں اردو کی پہلی کتاب (۱۳۲۸ء)	۲۲

عنوان	صفحہ
معراج العاشقین، شاہ میراں جی	۲۴
سرگزشت زبان اردو ایک مختصر جائزہ	۲۵
اردو کی پہلی گرامر	۲۶
سنسکرت، پراکرت، برج بھاشا	۲۷
شبدُ کا باب، بھُوت، برتمان کا بیان	۲۷
بھوکھِ کا بیان، کِریا کا بیان، کرتت کا بیان	۲۸
کرتا کا بیان، پرلنگ کا بیان، استری لنگ کا بیان	۲۸
پنِن سنگ لنگ کا بیان، بہُ بچن کا بیان، اسم اشارہ کا بیان	۲۸
بدبرت کا بیان، سمبندھ کا بیان	۲۹
زبان اُردو کے مآخذ	۳۲
اردو زبان پر دیومالا کا اثر	۳۳
ہندومت	۳۴
شیومت	۳۴
وشنومت	۳۴
بدھ مت	۳۵
جین مت	۳۷
اردو کی ابتدائی تحریریں	۳۷
اردو پر فارسی کا رنگ	۳۸
فارسی رمزیات اردو میں	۴۱
اردو زبان میں عشق	۴۱
اردو کا اپنا مزاج	۴۳
اردو پر عربی کے احسانات	۴۴
اسلامی طرزِ معاشرت اور اردو	۴۵
عرب معاشرت اور اردو	۴۶
عربی قواعد اور اردو	۴۶
مسلمان کلچر اور اردو	۴۶
فورٹ ولیم کالج	۴۹
دوحتہ الابصار	۵۱
گلکرسٹ کی خدمات	۵۲
اردو کی پہلی ٹائپ کتاب	۵۳
مسلمانوں کا آخری دور	۵۳
ابتدائی ادبی ماحول	۵۴

حرفِ آغاز

"روشن کتابیں" سیریز میں ہم پہلی بار اردو کے شعری اور نثری ادب کا عہد بعہد مکمل اور پورا تاریخی جائزہ پیش کر رہے ہیں۔ یہ ایک تاریخی جائزہ بھی ہوگا اور ساتھ ہی ساتھ تنقیدی تجزیہ بھی۔ یہ ایک سلسلہ وار تاریخی اور تحقیقی ادبی دستاویز ہوگی۔ جو مسلم الثبوت حوالوں اور تاریخی شواہد کے ساتھ پیش کی جائے گی۔ اس سلسلے کی یہ کتاب پہلی کڑی ہے۔

زیر مطالعہ کتاب میں اردو ادب کے نثری دور کی منزل بہ منزل تاریخ پیش کی گئی ہے۔ یہ ایک مستند جائزہ ہے۔ اردو کی نثر کے ارتقا کا۔ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز سے لے کر دکن اور گجرات کے آخری نثر نگاروں تک۔ اس کے بعد کی سلسلہ وار جلدوں میں ہم دکن اور گجرات سے چل کر دہلی اور فورٹ ولیم کالج سے ہوتے ہوئے نثر نگاروں کی جدید نسل کے نوجوان افسانہ نگاروں تک آئیں گے۔

اردو نثر کی ارتقائی تاریخ پر اب تک کئی ایک کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن وہ سب بکھری ہوئی ہیں۔ کچھ کم یاب ہیں۔ کچھ نایاب ہیں اور کچھ ٹھنڈی نیم تاریک لائبریریوں کی الماریوں کے اندھیروں میں گہری نیند سو رہی ہیں۔ ہم نے ان سوئی ہوئی کتابوں کو بھی جگا کر ان کے تحقیقی حوالے اور تذکرے اپنے تاریخی سلسلے میں شامل کئے ہیں۔ اس طرح جو کتابیں ایک عام قاری تک آسانی سے نہیں پہنچ سکتیں وہ اس "روشن کتاب" سیریز کے تاریخی ادبی سلسلے کی وساطت سے مدون ہو کر فیض عام کا شرف حاصل کر رہی ہیں۔ کچھ مخطوطے حیدرآباد دکن اور اڈنبرا یونیورسٹی کی لائبریریوں میں حنوط شدہ لیوں کی طرح پڑے ہیں، جنہیں ہم مختلف نقادانِ فن اور محققین کی وساطت سے "روشن کتابیں" کی اس تاریخ ادب (نظم و نثر) کی سیریز میں محفوظ کر رہے ہیں اور ان کے حوالے عام قاری تک پہنچا رہے ہیں۔

آج کا دور برق رفتاری اور کم یابی وقت کا دور ہے۔ آج کے قاری اور طالب علم کے پاس شاید اتنا وقت نہ ہو کہ وہ تاریخ ادب پر لکھی گئی سیکڑوں کتابوں کا مطالعہ کر سکے۔ خاص طور پر جبکہ بعض تحقیقی کتابیں کم یاب ہیں۔ اس لیے بھی اس سیریز کا مطالعہ ان کے لیے بے حد مفید اور قیمتی وقت کی بچت کا باعث ہوگا۔ اس سلسلے کی اشاعت کے ساتھ ادارہ "روشن کتاب" سیریز وقت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کر رہا ہے کیونکہ آج کے عہد میں اس نوع کی ایک مکمل اور پوری "تاریخ ادب (نثر و نظم) کی اشد ضرورت تھی جو آج کے قلت وقت کے تقاضوں کو پورا کر سکے اور اردو زبان و ادب کے اعلیٰ امتحانات کی تیاری کرنے والے طلبہ کے لیے ایک بہترین معاون اور گائیڈ ثابت ہو سکے۔

اردو زبان کی ابتدا

قدیم تاریخ سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ ہندوستان پر ہمیشہ سے دوسری قومیں حملہ آور ہوتی رہی ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے سیکڑوں برس پہلے وسط ایشیا سے آریا قوم کا سیلاب اٹھا جس نے شمالی ہند کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس زمانے میں یہاں جو لوگ آباد تھے ان میں مختلف زبانیں بولی جاتی تھیں۔ تامل، اوڑیا، تیلگو ان میں مشہور زبانیں تھیں۔ آریا قد آور، خوش شکل اور بہادر تھے۔ انہیں اپنے حسب و نسب اور قبیلائی جاہ و جلال کے ساتھ ساتھ اپنی زبان پر بھی بڑا مان تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ مفتوح قوم کے افراد ان کی زبان بولیں۔ چنانچہ انہوں نے کچھ ضابطے قوانین اور قاعدے ترتیب دیئے اور اپنی زبان کو سنسکرت کا نام دے کر سب سے الگ اور اعلیٰ زبان قرار دیا۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ اس نئی زبان کے الفاظ اور مخارج کچھ ایسے دقیق اور مشکل تھے کہ یہاں کے لوگوں کے لیے اس کی ادائیگی آسان نہ تھی۔ ویسے بھی زبان کے تاریخی اور تدریجی ارتقا کو فاتحین کے ضابطے اور قوانین روک نہیں سکتے۔ چنانچہ آریائی زبان سنسکرت کے مخارج اور تلفظ مفتوح قوم کی زبان پر آ کر بدل گئے اور یہاں سے ایک نئی زبان نے جنم لیا جسے پراکرت کہا گیا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے پانچ سو سال بعد تک ہندوستان میں کوئی اکیس بائیس پراکرت زبانیں بولی اور سمجھی جاتی تھیں۔ اس زمانے کی درباری زبان بھی پراکرت ہی تھی اور اسی زبان میں علم و ادب کے ذخائر اور مذہبی کتابیں مدون ہوتی تھیں۔ جو پراکرت زبانیں زیادہ مشہور تھیں۔ ان میں مہاراشٹری، ماگدھی، سوراسنی، جین اور پالی بہت نمایاں زبانیں تھیں۔ پالی زبان میں بدھ مت کا سارا قدیم ادب ضبط تحریر میں آیا۔ کہتے ہیں گوتم بدھ کی زبان بھی پالی ہی تھی۔ ان ساری کی ساری پراکرت زبانوں نے آج کی اردو زبان کے لئے بڑا کام کیا۔ ان میں صرف ایک زبان سوراسنی کا نام بدل کر برج بھاشا پڑ گیا۔ برج بھاشا کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ یہ زبان لاہور سے لے کر الٰہ آباد تک بولی جاتی تھی۔ اس میں سندھ، بہار اور مالوہ کے علاقے بھی شامل تھے۔ اردو زبان اسی برج بھاشا کی ارتقائی شکل ہے۔ لیکن آج کے دور کی جدید تحقیق اس مفروضے سے اختلاف کرتی ہے۔ اس وقت چار مکتب فکر اس بارے میں اپنی اپنی رائے الگ رکھتے ہیں۔

۱۔ اردو کی ابتدا وادی گنگا جمنا سے ہوئی۔

۲۔ یہ زبان دکن سے معرض وجود میں آئی۔

۳۔ اردو کا مولد سندھ ہے۔

۴۔ اردو کی ابتدا پنجاب سے ہوئی۔

اگر ہم اس مفروضے پر غور کریں کہ اردو کی ابتدا سندھ سے ہوئی تو ہم دیکھتے ہیں کہ سندھ میں مسلمانوں کی حکومت ۹۳ ہجری یا ۷۱۲ عیسوی میں قائم ہوئی تھی۔ مسلمانوں کا مقامیوں کے ساتھ حسن سلوک ہمیشہ بے مثال رہا ہے۔ ان کے ساتھ میل جول سے ہو سکتا ہے کہ ایک نئی زبان نے جنم لیا ہو۔ اس طرح سے ایک دوسرے کو سمجھنے اور میل ملاپ سے ہی زبانیں وجود میں آتی ہیں مگر اس میں ایک بات ہے کہ مسلمانوں کی زبان عربی تھی۔ اس اعتبار سے جو بھی زبان معرض وجود میں آتی اس کو سوراسنی اور عربی سے مشترک ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے اور اس میں فارسی کے الفاظ زیادہ ہیں۔ پس جدید تحقیق سے یہ مفروضہ بھی محل نظر ہے کہ اردو کی ابتدا سندھ سے ہوئی۔

سندھ کے بعد ہم دکن کی طرف آتے ہیں کیونکہ مسلمان فاتحین یا تاجر جو بھی قدیم ہندوستان میں وارد ہوئے وہ سب سے پہلے مالا بار اور کرناٹک کے ساحلوں پر ہی اترے وہ عرب تاجر، صوفی، مبلغین اور شیوخ ہزاروں میل کے سمندری سفر کے بعد ان ساحلوں پر اتر کر اندر تک چلے گئے۔ اور اپنے حسن اخلاق خوش کلامی اور نیک دلی سے لوگوں کے دلوں میں گھر کر گئے۔ انہوں نے اپنی مسجدیں تعمیر کیں۔ تکونتیں بنائیں اور دین اسلام کی تبلیغ و اشاعت کی۔ کوہ بندھیاچل کی وادی ان عرب شیوخ اور تاجروں کی آماجگاہ تھی۔ یہاں وہ لوگوں کے ساتھ گھل مل گئے تھے۔ ان کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے تھے۔ ظاہر ہے دونوں زبانوں کے ملاپ سے ایک تیسری زبان کا وجود میں آنا قدرتی

امر تھا۔ اسی زبان میں وہ آپس میں لین دین اور بیوپار کرتے تھے۔ لیکن یہاں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے ملاپ سے جو زبان آج ہمارے سامنے ہے اس میں عربی کے الفاظ کم اور فارسی کے زیادہ ہیں۔ چنانچہ یہ مفروضہ بھی درست معلوم نہیں ہوتا کہ اردو زبان کی ابتدا دکن سے ہوئی۔

مولانا محمود شیرانی نے اپنی کتاب "پنجاب میں اردو" میں پنجاب کو اردو کا مولد و مسکن قرار دینے میں بڑی تفصیل سے بحث کی ہے۔ لیکن اپنی کتاب "ہندوستانی لسانیات" میں ڈاکٹر سید محی الدین قادری نے بھی براہین و دلائل سے لکھا ہے کہ پنجابی زبان اردو کی ماں تو نہیں البتہ بہن ضرور ہو سکتی ہے۔ اب باقی وہی پراکرت زبان رہ جاتی ہے جو پشاور سے الہ آباد تک بولی جاتی تھی۔ جدید تحقیقات کی رو سے اور جدید عہد کے ماہرین لسانیات مثلاً پروفیسر چیٹرجی، پروفیسر ٹرنر، پروفیسر بیلی، پروفیسر موسیو جیولیس بلوک اور ڈاکٹر سید محی الدین قادری کے نظریات کے مطابق اصل میں اردو زبان اس زبان سے پیدا ہوئی جو پنجابی اور برج بھاشا دونوں زبانوں کی صحیح معنوں میں والدہ تھی۔ یعنی وہی پراکرت جو مسلمانوں کے بھارت میں آنے سے پہلے درۂ خیبر سے لے کر گنگا جمنا کے سنگم تک بولی اور سمجھی جاتی تھی۔

مسلمان فاتحین ہندوستان کے شمالی علاقوں سے اس ملک میں داخل ہوئے اور سب سے پہلے انھوں نے پنجاب میں قیام کیا۔ پنجاب ہی ابتدا میں ان کی تخلیقات اور ترجیحات کا گہوارہ بنا۔ اس سرزمین میں انھوں نے آپس کے میل جول اور کاروبار سے ایک نئی زبان کی نشاندہی کی۔ یہاں سے انھوں نے دلی کی طرف پیشقدمی شروع کی۔ یہ مسلمان فاتحین ترک مغل اور افغان تھے۔ یہ اپنے ساتھ اپنی زبان، اپنی زبان کی روایات، اصول صرف و نحو، قواعد و ضوابط اور معاشرتی آداب بھی لے کر آئے تھے۔ ان لوگوں کی زبان عام طور پر فارسی تھی۔ یا یوں کہیے کہ ان کی زبان میں فارسی آمیزش کی بہتات تھی۔ یہ لوگ پنجاب سے لے کر دلی تک اپنی بستیاں بسانے چلے گئے۔ ان کے خاندان اس سرسبز و شاداب وادی میں آباد ہو گئے۔ انھوں نے یہاں کھیتی باڑی اور کاروبار شروع کر دیا۔ فاتحین نے دلی اور پنجاب میں سلطنتیں قائم کر لیں۔ اس دور میں ہم دیکھتے ہیں کہ آپس کے میل جول سے ایک نئی زبان سامنے آتی ہے جس کو ہم "جدید ہندی آریائی عہد کی پراکرت" کہہ سکتے ہیں۔ اس زبان سے آگے چل کر آج کی اردو زبان نے جنم لیا۔

۱۰ء میں علاؤالدین خلجی نے دکن کو فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ اب دکن شمالی ہند کی اسلامی سلطنت میں آ گیا تھا۔ اس وقت سے یہاں عام زبان اور بول چال میں جدید زبان نے رونمائی شروع کر دی تھی۔ پھر محمد تغلق نے اپنے عہد میں دولت آباد کو اپنا دارالحکومت بنا لیا۔ اس عہد میں امرا، غربا اور تاجروں کی بول چال سے جو زبان بنی اسے دکھنی اردو کے نام سے پکارا جانے لگا۔ جس طرح شمالی ہند میں برج بھاشا اور دوسری زبانوں کے امتزاج سے جو زبان بنی اسے ریختہ کے نام سے پکارا جانے لگا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ شمالی ہند کے شعرا نے بعد میں ریختہ کو ایک الگ صنفِ سخن کا درجہ دیا۔

دولت آباد کے دارالسلطنت بن جانے کے بعد امیر، تاجر، اہل حرفہ، اہل فن، اہلِ علم اور دوسرے مشاہیر دلی چھوڑ کر دکن میں آ گئے۔ اگرچہ محمد تغلق کی متلون طبیعت نے یہاں بھی زیادہ دیر قرار نہ کیا اور ایک روز اپنی ترنگ میں اعلان کر دیا کہ دارالحکومت واپس دلی لے جایا جائے۔ شاہی جلوس ایک بار پھر دلی کی طرف کوچ کر گیا لیکن اہل علم و فن اور اہل حرفہ و دانشوروں کے ایک بڑے طبقے نے واپس جانا گوارا نہ کیا اور دکن میں ہی رہائش اختیار کر لی۔ یہ لوگ اپنے ساتھ جو زبان لے کر آئے تھے اس نے اسی بندھیاچل کی مرطوب اور زرخیز آب و ہوا میں دکن کی پراکرت کے ساتھ مل کر ارتقا کی جانب اپنا سفر شروع کر دیا۔ اس مقابلے میں کوئی زبان نہ تھی جو فاتحین کی زبان کے سامنے رکاوٹ بن کر کھڑی ہو سکتی۔ فضا ساز گار تھی۔ ماحول آزاد اور موزوں تھا۔ چنانچہ یہ زبان یہاں ترقی کے مدارج طے کرنے لگی۔ اس کے اُلٹ شمالی ہند میں جو زبان رائج تھی وہ برج بھاشا تھی جو کہ وہاں کے لوگوں کی اپنی یعنی دیسی زبان تھی۔ ادھر یہ زبان جو مسلمانوں کے ساتھ دکن میں آئی وہ دیسی اور بدیسی دونوں زبانوں سے مل کر بنی تھی۔ گنگا کے طاس اور کوہ بندھیاچل کی وادی میں بہت فاصلہ تھا چنانچہ دکن میں جدید زبان عروج پانے لگی۔ اس زبان پر برج بھاشا کا اتنا ہی اثر رہا جتنا اثر کہ دلی سے چل کر دولت آباد منتقل ہونے والے اہل علم و ہنر اپنے ساتھ لائے تھے۔

ہندوستان کے شمال میں ابھی تک اس زبان کو کوئی خاص نام نہیں دیا گیا تھا۔ اس کے برعکس دکن میں جو زبان رواج پانے لگی۔ اسے دکنی اردو کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔ وقت کے ساتھ ساتھ شمالی ہند میں مروج زبان کا نام ریختہ اور پھر اُردو اور پھر اردو سے اردوئے معلّٰی پڑ گیا۔

اب ہم ذرا پھر پیچھے کی طرف جاتے ہیں۔ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ آریا قوم کو اپنے حسب و نسب کے ساتھ ساتھ اپنی زبان کی حرمت بھی بہت عزیز تھی۔ چنانچہ انھوں نے سنسکرت کو ہر ممکن طریقے سے مقامی بولیوں اور زبانوں کی آمیزش سے بچایا۔ انھوں نے علم و فن کی ترویج کے لیے صرف سنسکرت کو ہی مختص رکھا۔ لیکن زمانے کی اپنی ایک رَو ہوتی ہے۔ ارتقا کا اپنا ایک ضابطہ ہوتا ہے۔ انقلاب کا اپنا ایک سفر ہوتا ہے اور یہ سفر تاریخ کے ساتھ ساتھ جاری رہتا ہے۔ یہ ناممکن تھا کہ سنسکرت پر دوسری زبانوں کا اثر نہ ہوتا۔ آریاؤں کی آمد کے کوئی تیرہ چودہ سو برس تک سنسکرت اپنے عروج پر پہنچ کر دوسری زبانوں کے ساتھ مل کر آگے بڑھنے لگی اور پھر وہ دوسری پراکرتوں میں مدغم ہونا شروع ہو گئی۔ یہ سلسلہ آگے بھی جاری رہتا اگر راجا بکرماجیت برسرِ اقتدار نہ آتا۔ بکرماجیت کو آریائی حسب و نسب کے بارے میں بڑا احساس برتری تھا اور وہ سنسکرت زبان کو دیوتاؤں اور ویدوں کی زبان مانتا تھا۔ اس نے تخت پر بیٹھتے ہی ایک بار پھر درباری زبان سنسکرت کو قرار دے دیا اور اس کی ترقی و ترویج کے لیے زبردست کام شروع کر دیا۔ اس کے دور سے قدیم سنسکرت ایک بار پھر سامنے آ گئی اور اس کا سورج نصف النہار پر چمکنے لگا۔ اس طرح سے شاہی دربار، امرا اور اہلِ علم و فن کے علاوہ پنڈتوں کی زبان تو سنسکرت ہی رہی لیکن عامۃ الناس میں پراکرت ہی بولی جاتی رہی۔

یہ دَور بلاشبہ سنسکرت کے عروج کا دَور تھا۔ اس عہد میں کالی داس ایسا بے مثال اور کلاسیکی شاعر پیدا ہوا جس نے شکنتلا اور میگھ دوت ایسے ڈرامے لکھ کر سنسکرت زبان کو قابلِ رشک مقام عطا کیا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اس دَور میں برج بھاشا پر بھی بہت کام ہوتا رہا۔ بکرماجیت کے عہد کے ایک ماہر لسانیات وراروچی نے برج بھاشا کے قواعد صرف و نحو مرتب کئے۔ یہ کتاب آج بھی موجود ہے اور "پراکرت پرکاش" کے نام سے اس کا ایک ایڈیشن لندن میں ۱۸۶۸ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ کتاب دو ہزار برس پرانی ہے۔ اس کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ

اس میں ایسے بے شمار الفاظ موجود ہیں جو ہماری آج کی اردو میں عام استعمال کئے جاتے ہیں ہندوستان کا مشہور بدھ مت کا پرستار راجہ۔ مہاراجہ اشوک حضرت عیسٰی علیہ السلام سے تقریباً ڈھائی سو برس پہلے ہوا ہے۔ اس کی زبان بھی برج بھاشا ہی تھی۔ اس نے ایک خوفناک جنگ میں لوگوں کے قتل عام کو دیکھ کر بدھ مذہب اختیار کرلیا اور جنگ سے توبہ کر لی تھی۔ پھر اس نے نربدا اور گنگا سے لے کر دریائے سندھ اور اٹک تک بدھ مت کے بڑے بڑے سٹوپا تعمیر کروائے جن پر اسی برج بھاشا زبان میں بدھ مذہب کے زریں اصول کندہ کرائے۔ یہ سٹوپا ٹیکسلا کے عجائب گھر میں آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس سے بھی پہلے ۳۲۵ سال قبل از مسیح جب سکندر اعظم نے ہندوستان پر حملہ کیا تو یہاں یہی برج بھاشا زبان بولی جاتی تھی۔ سکندر نے پورس کو شکست دینے کے بعد جب اس سے پوچھا تھا کہ تم سے کیا سلوک کیا جائے تو پورس نے اس برج بھاشا کی زبان میں کہا تھا۔

"وہی سلوک جو ایک بادشاہ دوسرے بادشاہ سے کرتا ہے"

عرب کی مقدس سرزمین میں اسلام کا ظہور ۵۶۹ء میں ہوا۔ اس سنہری دور سے بہت پہلے عرب تاجر اپنے بادبانی جہازوں میں ریشم، عطر، کم خواب، اون اور کھجور میں لے کر ہندوستان کے ساحل مالابار اور کرناٹک پر اترا کرتے تھے۔ وہ اپنا مال یہاں بیچ کر ہندوستان سے گرم مسالے اور دوسرا سامان لے کر واپس سرزمین عرب کو جایا کرتے تھے۔ ان تجارتی تعلقات میں آپس کی گفتگو نے آج کی اردو زبان کی راہ ہموار کر دی تھی۔ عربی کے الفاظ اس وقت کی برج بھاشا میں اور برج بھاشا کے الفاظ عربی میں شامل ہونا شروع ہو گئے تھے۔ سنہ ۱۶ھ میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد میں مسلمانوں نے بیت المقدس کو فتح کر لیا۔ تقریباً اسی زمانے کا ذکر ہے کہ مسلمان سندھ کے ساحل پر اتر آئے۔ لیکن اس حملے میں انہیں کامیابی نہ ہوئی۔ اس کے بعد ۴۴ھ میں مسلمانوں نے کابل کی جانب سے حملہ کیا اور کابل سے لے کر ملتان تک کا علاقہ زیر نگیں کر لیا۔

سنہ ۹۲ھ میں ایک جہاز جس میں مسلمان عرب عورتیں بھی سفر کر رہی تھیں سندھ کے راجہ داہر کے سپاہیوں نے لوٹ لیا۔ عورتوں سے بدسلوکی کی۔ ایک مسلمان عورت نے حجاج کے دربار میں جا کر فریاد کی۔ حجاج نے ۵۰۷ عیسوی میں محمد بن قاسم کو سندھ کی طرف روانہ کیا تاکہ مسلمان قیدیوں کی مدد کی جائے۔ راجہ داہر نے مسلمانوں کو رہا کرنے سے انکار کر دیا۔ محمد بن قاسم کے لشکر نے حملہ کر دیا۔ راجہ داہر کو عبرتناک شکست ہوئی اور سندھ سے لے کر ملتان تک کا علاقہ مسلمانوں کے پاس آ گیا۔ اس وقت سے لے کر کئی سو برس تک سندھ پر مسلمانوں کی حکومت رہی۔ اسلامی سلطنت اب بنی امیہ سے بنی عباس میں تبدیل ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ سندھ کی اسلامی حکومت بھی خلافتِ عباسیہ کے زیر انصرام آ گئی۔ خلیفہ واثق باللہ تک دربار خلافت سے سندھ کے گورنر مقرر ہو کر آتے رہے۔

اس کے بعد بغداد کی خلافت کا سورج ماند پڑنے لگا۔ دربار کی سیاسی ریشہ دوانیوں اور سیاسی چپقلش نے اسلامی خلافت کو کمزور سے کمزور تر کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ہندوستان میں سندھ کی حکومت بھی کمزور ہوتی چلی گئی۔ دوسری حقیقت یہ بھی تھی کہ مسلمان ان علاقوں سے باہر نہ نکل سکے تھے جن کو انہوں نے فتح کیا تھا۔ اس کے باوجود ہند اور سندھ میں مسلمان ایک دوسرے کی تہذیب و معاشرت سے متاثر ہوئے۔ رسوم و زبان سے بھی استفادہ کیا۔ چنانچہ چوتھی صدی ہجری میں ہندوستان آنے والے عرب عالم اور سیاح ابن حوقل اور مسعودی اپنے سفرناموں میں لکھتے ہیں کہ سندھ میں ہندوؤں نے مسلمانوں کی طرز معاشرت اختیار کر رکھی ہے وہ مسلمانوں ہی کی طرح اٹھتے بیٹھتے اور کھاتے پیتے اور سلام کرتے ہیں اور انہی کا سا لباس پہنتے ہیں۔ دونوں قوموں میں آپس کا بہت میل ملاپ ہے۔ یہاں عربی اور سندھی دونوں زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ملتان میں ملتانی زبان کے ساتھ ساتھ فارسی زبان بھی عام بولی اور سمجھی جاتی ہے۔

اس کے باوجود اس عہد میں ابھی تک ملکی اور غیر ملکی زبانوں کا ایسا ملاپ نہ ہوا تھا جو کہ ایک مستقل زبان کا سنگِ بنیاد ثابت ہو سکتا ہو۔ اسی دور میں غزنی سے سبکتگین بادشاہ نے ہندوستان پر حملہ کر دیا اور یہاں کے راجہ جے پال پر چڑھائی کر دی۔ راجہ جے پال سبکتگین کے بے پناہ لاؤ لشکر کو دیکھ کر گھبرا گیا اور صلح کی پیشکش کر دی۔ لیکن دوسرے راجاؤں کے اکسانے پر اس نے صلح نامے کے پرخچے اڑا دیئے جس کے نتیجے میں سبکتگین نے اس کی ریاست کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے اور یوں پنجاب سے پشاور تک کا سارا علاقہ اس کے زیر اثر آ گیا۔ اس بادشاہ کی وفات کے بعد اس کے بیٹے سلطان محمود غزنوی نے پے در پے حملے کر کے پشاور، ملتان، کالنجر، قنوج متھرا اور گجرات پر قبضہ کر لیا۔ محمود غزنوی ایک بہادر اور سمجھدار بادشاہ تھا۔ لیکن اس کے بعد اس کے جانشین کمزور تھے۔ ان میں وہ بات نہیں تھی۔ چنانچہ رفتہ رفتہ سارے علاقے غزنویوں کے ہاتھ سے نکل گئے۔ لیکن پنجاب پر ان کا قبضہ برقرار رہا۔ لاہور اس وقت غزنوی خاندان کی حکومت کا دارالسلطنت تھا۔ یہ خاندان دو سو برس تک پنجاب پر حکومت کرتا رہا۔ اس دور میں پنجاب میں مختلف قومیتوں کے لوگ آباد تھے۔ ان میں ترک بھی تھے، مغل، عرب اور ایرانی بھی تھے۔ آپس کے تعلقات میں ایک دوسرے کی روایات نے ایک دوسرے کو متاثر کیا۔ ہندوستان کے تمدن اور روایات پر ترک، مغل، ایرانی اور عربوں کا اثر ہوا اور اسی طرح ہندوستان کی طرزِ بود و باش اور زبان کا ان پر اثر پڑا۔ اس کا نتیجہ یہی نکلا کہ مقامی لوگوں نے اپنی بھاشا میں ایرانی، ترکی، عرب اور مغل الفاظ کو ملانا شروع کر دیا۔ جبکہ باہر والوں نے ہندوستان کی زبان کا اثر لینا شروع کر دیا۔

ان مغلوں کے زمانے ہی سے اردو کا لفظ رائج ہے اور لشکر کے معنوں میں استعمال ہونا شروع ہوا تھا۔ چنانچہ تاریخ کے نوادرات سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ بابر، جہانگیر اور اکبر کے زمانے میں شاہی فرمانوں اور شاہی سکوں پر اردو کا لفظ لشکر کے معنوں میں لکھا جاتا تھا۔ بابر نے ایک فارسی شعر میں اپنی فوج کو اردوئے نصرت شعار لکھا ہے۔ شہنشاہ جہانگیر نے دلی سے کشمیر کی طرف سفر کرتے ہوئے راستے میں ایک سکہ جاری کیا۔ اس سکے پر یہ شعر کندہ کروایا۔

بادرواں تاکہ بود مہر و ماہ
سکۂ اُردوئے جہانگیر شاہ

مغل شہنشاہوں کے زمانے میں بھی شاہی لشکر یا لشکر گاہ کو اردوئے معلی کہتے تھے پھر جس بازار میں فوج کے سپاہی خرید و فروخت کرنے جاتے تھے۔ اس بازار کو بھی اردو بازار اور لشکر بازار کہا جانے لگا۔ مگر اس زمانے تک جو زبان لشکری یعنی فوجی آپس میں بولتے تھے اس کو اردو زبان نہیں کہا جاتا تھا۔ بلکہ زبان ہندی کہا جاتا تھا۔ اس زبان کی سب سے پرانی تحریر حضرت امیر خسرو دہلوی کی ملتی ہے یہ زمانہ ۷۵۳ ہجری ــــــ کا ہے وہ اپنے دیوان کے دیباچے میں اپنے

اور کلام کو ہندی کلام کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ دوسری پرانی کتاب سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے ایک مرید خاص حضرت سید مبارک المعروف بہ میر خورد کی تالیف سیر الاولیا ہے۔ اس کتاب میں حضرت بابا فرید شکر گنجؒ کے ایک قول کے بارے میں تحریر کیا گیا ہے کہ "فرمود بہ زبان ہندی"۔ اس عہد کی اور بھی بہت سی کتابوں اور قدیم تحریروں میں اس زبان کو ہندی زبان کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

یہ ایک بڑی دلچسپ اور قابل ذکر بات ہے کہ تیرھویں صدی عیسوی سے لے کر سولہویں صدی عیسوی تک یعنی امیر خسروؒ کی تصانیف سے لے کر شہنشاہ اکبر و جہانگیر کے دور تک جہاں جہاں ہندوستانی زبان کا ذکر آیا ہے وہ اس طرح آیا ہے کہ پنجاب کے کسی بزرگ کے اقوال کو درج کرتے ہوئے اسے زبان پنجابی و زبان ملتانی کہا گیا ہے جو زبان گجرات میں بولی جاتی تھی اسے زبان گجراتی اور دکن والوں کی زبان کو دکنی زبان لکھا گیا ہے۔ لیکن دلّی خاص اور اس کے نواح میں بولی جانے والی زبان کو خاص طور پر زبان ہندی کہا گیا ہے۔ پرانے زمانے سے ہی ہندوستان کے مختلف صوبوں اور علاقوں میں بولی جانے والی پراکرتوں نے آپس میں مل جل کر اور مختلف علاقوں میں مختلف شکل اختیار کر رکھی تھی۔ ہر بولی کا ہر علاقے میں الگ الگ نام تھا اردو زبان حالانکہ ان سب پراکرتوں سے مل کر بنی تھی مگر اس کا خمیر خاص طور پر دہلی اور دہلی کے ارد گرد کے علاقوں کی زبان سے مل کر تیار ہوا تھا اس کے ثبوت کے لیے جناب حامد حسن قادری نے اپنی کتاب میں یہ دلیل دی ہے کہ ہندوستان کے دوسرے صوبوں کی زبانیں اب بھی الگ الگ رائج ہیں۔ لیکن موجودہ صوبہ جات متحدہ کی زبان وہی زبان ہندی ہے جس نے اب اردو کی شکل اختیار کر لی ہے۔

تحقیق سے پتا چلتا ہے کہ مغل بادشاہ جہانگیر کے عہد تک اردو کا لفظ بہ معنی زبان رائج نہیں تھا کسی بھی تحریر، کسی بھی مخطوطے اور سفر نامے یا کتاب میں ہمیں یہ ثبوت نہیں ملتا کہ اردو کو کہیں کسی جگہ بطور زبان کے استعمال کیا گیا ہو۔ اس کے برعکس جہاں جہاں بھی زبان کے مفہوم کو ادا کرنا مقصود تھا وہاں زبان ہندی یا زبانِ ریختہ کی ترکیب استعمال کی گئی ہے۔ خاص طور پر اس دور کے شاعر تو اردو نظم کو نظم ریختہ ہی کہتے تھے۔ ریختہ کے لغوی معنی ایسی شے کے ہیں جو گری پڑی ملی ہو۔ اہل فارس کے شعرا اس نظم کو نظم ریختہ لکھتے تھے جس میں دوسری زبانوں کے الفاظ زیادہ آ گئے ہوں۔ چونکہ پرانے زمانے کے شعرا کے کلام میں ہندی اور فارسی کا امتزاج بہت تھا اس لیے اسے نظم ریختہ کہا جانے لگا۔ شیخ مخدوم سعدی کاکوروی متوفی ۱۵۵۲ عیسوی اکبر بادشاہ کے زمانے کے مشہور شاعر اور اہلِ دانش تھے۔ ان کی ایک مخلوط غزل کا مقطع یوں ہے۔

سعدی کہ گفتہ ریختہ، در ریختہ دُر ریختہ
شیر و شکر آمیختہ، ہم شعر ہے ہم گیت ہے

اردو نظم کو نظم ریختہ کہنے کا رواج انیسویں صدی عیسوی تک مروج رہا۔ مثلاً قائم چاندپوری کہتے ہیں۔

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ
اک بات لچر سی بہ زبانِ دکنی ہے

میر تقی میر لکھتے ہیں۔

خوگر ہمیں کچھ یونہی ہم ریختہ گوئی کے
معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا

اب میر تقی میر کے اس شعر سے ایک اور بات بھی کھل کر سامنے آتی ہے کہ ریختہ کہنے کا عام رواج دہلی سے پہلے دکن میں ہوا تھا۔ اسی طرح مرزا قتیل اپنے مقالے چار شربت میں لکھتے ہیں۔

"مرزا محمد رفیع سودا در ریختہ پایۂ ظہوری دارد"

شعر

یہاں تک کہ خود مرزا اسد اللہ خاں غالب کے زمانے میں بھی اردو کے لیے بھی ریختہ کا لفظ ہی استعمال میں آتا تھا۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ

ریختے کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

قافلہ علم و فن اپنے ارتقائی مراحل سے گزرتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ سترھویں صدی عیسوی میں مغل تاجدار شہنشاہ شاہجہان کا زمانہ آتا ہے۔ اس دور میں ہمیں اردو کا لفظ زبان کے معنوں میں استعمال ہوتا نظر آتا ہے۔ پھر بھی یہ استعمال شاہجہان سے لے کر بادشاہ اورنگ زیب تک بے حد محدود رہا۔ یہاں تک کہ خود مغل بادشاہ اورنگ زیب نے اپنے خط میں اردو کو زبان ہندی لکھا۔ شہنشاہ شاہجہان نے کوئی تحریر اپنے عہد میں بہ زبان اردو لکھی تھی جس کے بارے میں عالمگیر ایسے لکھتے ہیں۔

"آں فرمانِ عالی کہ در زبان ہندی از دستخطِ خاص رقم فرمودہ شاہد ایں معانی است۔"

اورنگ زیب عالمگیر کے بعد اٹھارویں صدی عیسوی میں شعرا نے اردو کے بارے میں جتنے بھی تذکرے اور تحریریں سامنے آتی ہیں ان میں اردو زبان کو ہندی یا ریختہ ہی کہا گیا ہے۔ اس کے باوجود ہمیں زبان کے معنوں میں اردو کا لفظ بھی کہیں کہیں مل جاتا ہے۔ مثلاً ۱۷۹۱ء میں مولانا محمد باقر آگاہ ویلوری دکنی نے کچھ اخلاقی اور دینی اشعار اردو زبان میں لکھے تھے۔ انہوں نے ان نظموں کی تصنیف کی وجہ نثر میں یوں بیان کی ہے۔ لکھتے ہیں۔

"ان سب رسالوں میں شاعری نہیں کیا ہوں۔ بلکہ صاف اور سادہ کہا ہوں۔ اور اردو کے بھاکے میں نہیں کہا ہوں۔ کیا واسطے کہ رہنے والے یہاں کے اس بھاکے سے واقف نہیں ہیں۔ اے بھائی! یو رسالے دکنی زبان میں ہیں۔"

مولانا محمد باقر آگاہ ویلوری دکنی کی اس تحریر سے ایک یہ بات بھی پایہ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ اس زمانے میں دوسرے صوبوں کے لوگ اس زبان کو اردو کہتے تھے جو دہلی اور اس کے نواح میں بولی جاتی تھی۔ اس حقیقت کا ثبوت دوسری شہادتوں سے بھی ملتا ہے۔ مثلاً جب ولی دکنی دلّی آئے اور وہاں ان کی ملاقات سعد اللہ گلشن سے ہوئی تو ولی دکنی نے انہیں اپنی دکنی زبان کی غزلیں سنائیں۔ اس پر تذکرہ مجموعہ نغز کے مولف قدرت اللہ قاسم لکھتے ہیں کہ سعد اللہ گلشن نے ولی دکنی کو یہ مشورہ دیا۔

"شاہ زبان دکنی را گذاشتہ موافق اردوئے معلّیٰ شاہجہان آباد موزوں بکنید تا موجب شہرت و رواج قبول خاطر صاحب طبعانِ عالی مزاج گردد۔"

شہنشاہ شاہجہان نے دلّی میں لال قلعے کو تعمیر کرایا اور دلّی کا نام شاہجہان آباد رکھا۔ اس نے قلعہ کو قلعۂ معلّیٰ کا لقب دیا۔ شاہی لشکر کو اردوئے معلّیٰ کہا گیا۔ چنانچہ جب

اردو زبان کا قافلہ قلعۂ معلیٰ میں داخل ہوا تو اسے اردوئے معلیٰ کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔

پنجاب شروع ہی سے غیر ممالک خاص طور پہ اسلامی ممالک کے فاتحین کی راہ گزر رہا ہے۔ حملہ آور یہاں سے چل کر آگے دلّی کی طرف جاتے تھے۔ پھر پنجاب میں اسلامی ملکوں کے مختلف لوگوں نے مستقل رہائش اختیار کر لی۔ ان سے اہلِ ہندوستان کے میل ملاپ اور کاروبار سے ایک نئی زبان کا معرضِ وجود میں آنا ناگزیر تھا۔ اہلِ ہند ——— کئی ایک زبانیں بولتے تھے جبکہ باہر سے آئے ہوئے مسلمانوں کی زبان زیادہ تر فارسی تھی۔ چنانچہ یہ امر قرین قیاس ہے کہ نو وارد مہمانوں نے دوسری زبانیں سیکھنی شروع کر دی ہوں گی۔ یہ گیارہویں صدی عیسوی کا زمانہ ہے۔ اس زمانے کی کوئی بھی کتاب "نثر" کی ایسی نہیں ملتی جس سے اس عہد کی زبان کے طرز کی تصدیق ہو سکے۔ ہاں نظم میں ہمیں اس زمانے کی زبان کے نمونے ضرور ملتے ہیں۔

سلطان محمود غزنوی کی وفات کے بعد ۱۰۳۰ عیسوی میں اس کا بیٹا مسعود غزنوی تخت پر بیٹھا۔ مسعود غزنوی کے عہد میں ہی ایران کا مشہور شاعر منوچہر ہندوستان آیا۔ یہاں آ کر منوچہر نے جو شعر لکھے۔ ان میں اس نے ہندی زبان کے کئی الفاظ اسی طرح لکھ دیئے ہیں۔ مثلاً

الانا مومناں دارند روزہ
الانا ہندواں گیرند ~~سنگھن~~ !

مشہور صوفی شاعر حکیم سنائیؒ کا انتقال بارھویں صدی عیسوی کے وسط میں ہوتا ہے۔ حکیم سنائیؒ بذاتِ خود کبھی ہندوستان تشریف نہیں لائے تھے وہ ایرانی النسل تھے۔ ان کے کلام میں بھی ہمیں بعض ہندی لفظ جوں کے توں ملتے ہیں۔ مثلاً

نہ دراں معدہ بر حسد زندہ
نہ دراں دیدہ قطرۂ پانی

علامہ اقبال نے سلطان مسعود غزنوی کے عہد کے مشہور فارسی شاعر مسعود سعد سلمان کا ذکر کیا ہے جو لاہور میں پیدا ہوا تھا۔ وہ فارسی زبان میں شعر کہتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اس نے ایک دیوان بزبانِ ہندی بھی لکھا ——— یہ دیوان اب کہیں نہیں ملتا۔ لیکن حضرت امیر خسروؒ اور محمد عوفی اس دیوان کی تصدیق کرتے ہیں۔

اسی طرح باہر سے آنے والوں کے برعکس یہاں کے شاعروں نے بھی عربی اور فارسی کا اسی طرح سے اثر قبول کیا۔ انہوں نے بھی اپنی شاعری اور نثر میں عربی اور فارسی لفظ استعمال کئے۔ پرتھوی راج اجمیر اور دلّی کا راجہ تھا۔ یہ دَور بارھویں صدی عیسوی کا دَور ہے۔ اس دَور میں پرتھوی راج کے دربار کا ایک شاعر چاند بردائی تھا۔ یہ شاعر اس زمانے میں طویل اور مختصر نظمیں لکھا کرتا تھا۔ اس کی ایک طویل نظم ہے جو ہندی زبان میں ہے اور جسے اس نے راج راسو کا نام دیا ہے۔ اس نظم میں چاند بردائی نے پرتھوی راج کے زمانے کے تمام حالات، معاشرت کا انداز، لوگوں کے رہن سہن کے طریقے، رسم و رواج وغیرہ بڑی تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ اس نظم میں کئی ایک عربی اور فارسی کے الفاظ ملتے ہیں۔ ان میں خاص خاص لفظ یہ ہیں۔ سلام۔ دنیا۔ مست۔ خلق۔ بادشاہ۔ پروردگار۔ پیغام۔ فرمان وغیرہ۔ اس طویل نظم کا ایک شعر ہے۔

بارہ بانس بیں میں چار انگل فرمان
اتنے تکھ بادشاہ ہے مت چوکے چوہان

اب شمالی ہندوستان سے ایک اور یلغار آتی ہے۔ ۵۷۰ ہجری میں سلطان شہاب الدین محمد غوری کا لشکر نمودار ہوتا ہے۔ وہ تلوار لہراتا آگے بڑھتا ہے اور اپنے لشکر کے گھوڑوں کی ٹاپوں تلے ملتان کو روندتا ہوا اوچ پہنچ جاتا ہے۔ ۵۷۴ ہجری میں اس نے گجرات پر حملہ کر دیا۔ ۵۸۲ ہجری میں اس نے پنجاب پر قبضہ کر لیا۔ ۵۸۷ ہجری میں کرنال کے علاقے میں ایک جگہ ترائن پر اس کا مقابلہ پرتھوی راج چوہان سے ہوا۔ یہاں اسے کامیابی نہ ہوئی۔ ۵۸۸ ہجری میں شہاب الدین محمد غوری نے دوسری بار حملہ کیا اور پرتھوی راج چوہان کو زبردست شکست دی۔ اس جنگ میں راجہ بھی مارا گیا اور اس کا طویل نظمیں کہنے والا درباری شاعر چاند بردائی بھی ہلاک ہو گیا۔ اس فتح سے یہ ہوا کہ دہلی، اجمیر، کول یعنی علی گڑھ، ہانسی، سرستی کے سارے علاقے مسلمانوں کے زیرِ نگیں آ گئے۔ شہاب الدین غوری نے پرتھوی راج چوہان کے فرزند گوبندراج کو تخت و تاج واپس کر دیا اور اپنے سپہ سالار قطب الدین ایبک کو اپنا خاص جانشین اور قائم مقام بنا کر اپنے وطن غزنی واپس چلا گیا۔

مسلمان فاتحین کے ساتھ ان کی اپنی مادری زبان بھی جگہ جگہ اپنے عَلم لہراتی رہی۔ جہاں وہ جاتے اپنی زبان کو ساتھ لے کر جاتے۔ اپنی زبان کے الفاظ دوسری زبانوں کو دیتے اور دوسری زبانوں کے الفاظ اپنی زبان کو دیتے۔ مگر ابھی تک درباری زبان فارسی تھی۔ امراء بھی فارسی زبان ہی میں گفتگو کرتے تھے۔ اسی زبان میں ایک دوسرے کو خط لکھتے تھے۔ اسی زبان میں شاہی فرمان جاری ہوتے تھے لیکن بضرورت پڑنے پہ وہ ہندوستان والوں کے ساتھ ہندی زبان میں بھی بات کر لیتے تھے۔ ہندی زبان میں بھی خط و کتابت کر لیتے تھے۔ اس زبان کو ابھی ہندی زبان کا لقب بھی نہیں ملا تھا۔ بس اسے مل جل بھاشا ہی کہا جاتا تھا۔ پنجاب اور گجرات کے سارے علاقوں پہ مسلمانوں کا قبضہ ہو چکا تھا اور یہاں اسی مل جل بھاشا یعنی اردو زبان کی ابتدائی شکل کو ترقی اور ترویج ملتی رہی۔ محمد غوری نے دلّی کو سب سے پہلے فتح کیا اور پھر ۶۰۲ ہجری میں سلطان قطب الدین ایبک نے دہلی کے پہلے مسلمان بادشاہ کی حیثیت سے اعلان کر دیا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب دہلی کے رہنے والوں نے فارسی سے براہِ راست واد و رسم پیدا کی۔ محمد غوری کے ساتھ دلّی میں وہ لوگ بھی سپاہیوں کی حیثیت سے آئے تھے جو کئی سالوں سے پنجاب میں رہائش پذیر تھے۔ چنانچہ دہلی کی فضا میں دہلوی انداز کی اردو رائج ہو گئی۔ یہ حقیقت میں اردو زبان کی ابتدا تھی۔

دکنی اردو

۱۱۹۲ عیسوی میں شمالی ہند سے آنے والے مسلمان فاتحین نے پرتھوی راج چوہان کو شکستِ فاش دے کر دلّی کے تخت پر قبضہ کیا۔ اس سے پہلے ہم لکھ چکے ہیں کہ یہ نو وارد دانِ بساطِ سیاست اپنے ساتھ اپنی زبان بھی لائے۔ شمالی ہند مسلمانوں کے زیرِ نگیں تھا۔ وہاں پہ بولی جانے والی برج بھاشا نے مسلمانوں کی فارسی اور ترکی زبان سے مل کر ابھی اپنا رنگ پوری طرح سے نہیں جمایا تھا کہ انہوں نے جنوبی ہند کی طرف یلغار کر دی۔ سب سے پہلے علاء الدین خلجی نے دکن فتح کیا۔ اس کے ساتھ ہی دہلی سے اہلِ علم و فن کا قافلہ دلّی سے اٹھ کر دکن میں آ کر آباد ہو گیا۔ محمد تغلق نے دولت آباد سے دوبارہ دلّی کی طرف رجوع کیا مگر یہ اہلِ علم و ہنر کا طبقہ دکن میں ہی رہا۔ ملک کافور نے اس سلطنت کو آگے بڑھانے کے لئے دکن کے آگے کے علاقوں پہ حملے شروع کر دیئے اور مسلمانوں کی فتوحات کا ریلا جنوبی ہند کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ دکن میں ولی دکنی کے دَور سے پہلے پہلے جو نظم لکھی جاتی تھی اس میں ریختہ صرف اس کلام کو کہتے تھے جس میں مصرعوں کے بعض دکنی زبان کے اور بعض فارسی کے ہوتے تھے۔ مثلاً

دیدم نظر بہر دیب چو اس شوخ چکہ مستانہ ما
گفتم بیا مندر نے روشن بکن کاشانۂ ما

مشہور کتاب کلیات شاہی سے بھی اس کی شہادت ملتی ہے کہ دکن میں ریختہ کے نام سے اسی طرح کی غزلیں لکھی گئیں۔

دکن میں جب شمالی ہند کے مسلمان فاتحین نے اپنا پرچم لہرایا تو اسی زمانے سے یہاں کے لوگوں کی عام بول چال میں جدید زبان نے رواج پا لیا تھا۔ اس کے بعد جب محمد تغلق نے دیوگڑھ کا نام بدل کر دولت آباد رکھا اور اسے دلی کی بجائے اپنا پائے تخت بنایا تو وہاں سبھی لوگ عالم و جاہل، امیر غریب اور ادنیٰ و اعلیٰ جس زبان میں گفتگو کیا کرتے تھے اسے وہ دکھنی زبان کہتے تھے۔ بزرگان دین اس وقت کے بھی اس دکھنی زبان میں وعظ و نصیحت کیا کرتے تھے۔ چنانچہ خواجہ بندہ نواز سید محمد حسینی کے والد ماجد نے اپنا تخلص راجہ رکھا تھا جو دکن میں آج بھی سید راجہ یا شاہ راجو کے نام سے مشہور ہیں۔ اس اعتبار سے اردو نثر کی ابتدا کا بھی دکن میں ہی سُراغ ملتا ہے۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ دکن میں نثر کا سب سے پہلا رسالہ شیخ عین الدین گنج العلم المتوفی ۷۹۵ ہجری نے لکھا۔ لیکن آج کی تحقیق نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ حضرت بندہ نواز گیسو دراز سید محمد حسینی المتوفی ۸۲۵ ہجری پہلے بزرگ درویش ہیں جنہوں نے دکن میں اردو نثر کی ابتدا کرتے ہوئے "معراج العاشقین" اور "ہدایت نامہ" وغیرہ رسالے ترتیب دیئے۔

دکن کی بہمنی سلطنت

جیسا کہ پہلے تحریر کیا جا چکا ہے دکن کی فتح کا سہرا علاء الدین خلجی کے سر ہے۔ اس نے کوہِ بندھیاچل کی اس زرخیز اور مردم خیز وادی کو اپنی سلطنت میں شامل کیا۔ یہ زمانہ بڑے آشوب کا زمانہ تھا۔ لیکن علاء الدین کی بصیرت اور معاملہ فہمی نے جلد ہی دکن میں مسلمانوں کی ایک عظیم الشان سلطنت کی بنیاد رکھ دی۔ پینتیس برس تک جنوبی ہند کا سارا علاقہ شمالی ہند کے مسلمان حکمرانوں کے زیر اثر رہا۔ لیکن محمد تغلق کا دور آیا تو دکن کے امرا نے آپس میں سازشیں شروع کر دیں۔ انھوں نے آپس میں مل کر سلطان تغلق کے خلاف پرچم بغاوت بلند کر دیا۔ دو برس تک یہ خانہ جنگی جاری رہی۔ کبھی شاہی فوج کا پلہ بھاری ہو جاتا اور کبھی امرائے دکن کو کامیابی نصیب ہوتی۔ آخر امرائے دکن کے اتحاد اور اتفاق نے انھیں مکمل کامرانی سے ہمکنار کر دیا اور سلطانی لشکر کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔

اس کے ساتھ ہی حسن خان المخاطب ظفر خان علاء الدین بہمن شاہ کے خطاب کے ساتھ دکن کا خود مختار فرمانروا بن کر تخت پر بیٹھ گیا۔ یہاں سے دکن کی بہمنی سلطنت کی ابتدا ہوتی ہے۔ بہمنی سلطنت کا چراغ کوئی دو سو برس تک دکن اور جنوبی ہند کے ایوانوں میں جگمگاتا رہا۔ تقریباً اٹھارہ بہمنی حکمرانوں نے گلبرگہ اور بیدر میں اپنا سکہ چلایا مگر ہر کمالے را زوالے کے مصداق یہ سلطنت بھی نا اہل حکمرانوں کی تن آسانیوں کے باعث کمزور ہونے لگی۔ صوبوں نے اپنے اپنے علاقوں میں خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ صوبے داروں نے الگ الگ حکومتیں قائم کر دیں اور بہمنی سلطنت پانچ سلطنتوں میں تقسیم ہو گئی۔ یعنی سلطنت گولکنڈہ، سلطنت بیجاپور، سلطنت احمد نگر، سلطنت برار اور سلطنت بیدر۔

سلطان علاء الدین حسن اور اس کے بہت سے جانشینوں کا دور بہمنی سلطنت کے عروج کا دور تھا۔ بلاشبہ علم و ادب اور اردو کی ترقی و ترویج میں اس دور کو عہد زریں کے لقب سے یاد کیا جا سکتا ہے۔ سلطان حسن نہ صرف یہ کہ اہل علم و فن کی بے حد قدر کرتا تھا بلکہ وہ خود بھی ایک عالم فاضل انسان تھا۔ اس کے عہد میں دکن کو سارے ہندوستان میں علم و ادب، فن و حرفت اور شعر و فلسفہ کے اعتبار سے ایک نمایاں اور منفرد مقام حاصل تھا۔ بیدر (حیدر آباد دکن) میں مدرسہ محمود گاواں کے کھنڈر آج بھی اس سنہری دور کی ترجمانی کرتے ہیں۔ یہ عظیم الشان کالج علاؤ الدین حسن نے ہی بیدر میں تعمیر کرایا تھا۔ جب تک یہ خاندان دکن پر حکومت کرتا رہا دنیا کے کونے کونے سے مقتدر علما اور فضلا دیار دکن میں آتے رہے اور علم و حکمت کی ضیا پاشیاں کرتے رہے۔ ان میں محمود گاواں، ملا حسین گیلانی، ملا عبدالغنی، المفتی نجم الدین، شیخ آذری، محمود گاواں، سید العلما سلامت اللہ اوحدی، شمس الدین سامی، عبدالکریم ہمدانی اور ملا نظیری ایسے اجل عالم بھی تھے۔ بادشاہ ان علما و حکما کی ہر طرح سے نگہداشت کرتا تھا۔ انہیں ملک میں ہر طرح کی سہولت حاصل تھی اور انہیں انعام و اکرام سے بھی نوازا جاتا تھا۔ علما اور شعرا کو بے بہا تحائف ارسال کر کے دُور دُور سے بلایا جاتا تھا۔ خواجہ حافظ شیرازی بھی دکن میں آئے۔ بہمنیہ خاندان نے ان حکما کی سرپرستی کی اور دکنی زبان کو درباری زبان کا درجہ عطا کیا۔ اس دور کے علما اور درویش حضرات نے بھی اس زبان میں سلسلہ تبلیغ و تدریس جاری رکھا۔ اس عہد کے کچھ مصنفین یہ ہیں۔

دکنی نثر کے مقتدر بزرگ

حضرت سید محمد حسینی۔ حضرت سید صاحب کو عام طور پر خواجہ بندہ نواز گیسو دراز بھی کہا جاتا ہے۔ آپ ۸۱۵ ہجری میں سلطان فیروز شاہ بہمنی کے دور حکومت میں دکن گلبرگہ تشریف لائے اور ان کا انتقال اسی مقام پر ۸۲۵ ہجری میں ہوا۔ آپ کے خلیفہ خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی تھے۔ تصوف پر آپ نے دکن میں بیٹھ کر بے مثال کتب تحریر فرمائیں۔ آپ کے مریدین اور معتقدین کا حلقہ بے حد وسیع تھا۔ صبح سے شام تک آپ مریدوں اور عقیدت مندوں میں درس دیا کرتے تھے۔ ظہر کی نماز کے بعد آپ اپنے طالب علموں اور مریدین کو تصوف، فلسفہ، علم و حکمت اور حدیث شریف کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ آپ علم الکلام اور فقہ میں بھی بلند مقام رکھتے تھے۔ آپ کی زبان عربی تھی۔ تذکرۂ اولیائے دکن میں تحریر ہے کہ آپ عربی اور فارسی میں بھی درس دیتے اور جو لوگ اس زبان سے ناواقف ہوتے ان کے ساتھ دکنی زبان میں ہمکلام ہوتے اور اس زبان میں آپ نے اپنی کتابیں تصنیف کیں۔ آپ کی جن کتابوں کا علم ہو سکا ہے ان میں معراج العاشقین، ہدایت نامہ اور رسالہ سہ بارہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان تینوں تصنیفات کا موضوع تصوف ہے۔ ان کا سن تصنیف معلوم نہیں ہو سکا۔ لیکن تحقیق سے اتنا ضرور پتا چلا ہے کہ سید صاحب نے گلبرگہ تشریف لانے کے بعد یہ کتابیں ضبط تحریر میں لائیں۔ دکن میں ان دنوں دکنی زبان کا رواج تھا اور امرا و غربا یہی زبان بولتے تھے۔ اس اعتبار سے ہو سکتا ہے کہ یہ عہد ۸۱۵ ہجری کا زمانہ ہو۔

نمونہ عبارت

"نبی کے تحقیق خدا کے درمیان نے ستر ہزار پردے اوجیلے کے ہور اندھیارے کے اگر اس میں تے ایک پردہ اٹھ جاوے تو اس کی آنچ تے میں جلوں۔ ہور ایک وقت ایسا ہوتا ہے سمجھو اور دیکھو بے پردا۔ اندھیارے کے اوجیلے کے عارفاں پہ ہے۔ واصلاں پہ دے نورانی۔ دے واصلاں کا صفا پردہ ہوتا ہے۔ محمد کا نور اے عزیزاں۔ اول ربوبیت کا پردہ سوائے تن جمالی جسم کے پردے کوا پڑے باج

اس جمالی الوہیت کے پردے ممکن الوجود کون اپڑ سکے۔"
(معراج العاشقین)

اب ایک اقتباس رسالہ سہ بارہ سے ملاحظہ ہو۔
سوال:۔ ذاتی ایمان کونسا اور صفاتی ایمان کونسا؟
جواب:۔ ذاتی ایمان وہ ہے کہ نا ہی آتی او رجاتی ہے۔ سو صفاتی ایمان۔"
(رسالہ سہ بارہ)

خواجہ بندہ نواز کی نظم

خواجہ بندہ نواز المعروف بہ گیسو دراز نظم میں شہباز تخلص فرماتے تھے۔ ذیل میں اُن کی نظم کے چند نمونے درج کیے جاتے ہیں۔

سن تو سہانے میری بات   بولاں وار دیں کس دنات
جس کے منہ میں آوے باس   اسکی وار دن مجّو پاس
جس کے منہ میں ہلتے دانت   ہلتے جلتے کٹے کٹے پات
وزن برابر سب کو تول   دار و ہووے یوں ان مول
نیلا طوطا دھنیب بھوُن   اس میں ملا تو سیندا لون
پان پلاس کے کا بنٹیاں آن   ما پھل نوچن اور نوبان
جم کی جھوں لگاوے پاوے سکھ   تھِر دانتوں کا جاوے دکھ

•

پانی میں نمک ڈالا ہاں دیکھنا دسے   جب گھل گیا نمک تو نمک بولنا کیسے
یوں کھوئی خودی اپنی خدا سات محمدؐ   جب گھل گئی خودی تو خدا بن کوئی دسے

•

آنوں بکبدہ آنوں لوں   پتیں سے گھر جاوے کون

•

جتنا کا جل اتنا بول   اوس سے ڈگنا گوندھ کھول
ذرا سی پھٹکڑی نمک ملا تھوڑا   تلم جیسے بان تر کی گھوڑا

•

ایک اور طویل نظم خواجہ بندہ نواز کی ملاحظہ ہو۔

میں عاشق اس پیو کا جنے مجھ جیو دیا ہے
او پیو میرے جیو کا بنا لیا ہے
او معشوق بے مثال ہے نور نبی نہ پایا
نور نبی رسولؐ کا او میرے جیو میں بہایا
اپسکوں اپنے دیکھنے کیسی آرسی لایا
کھڑے کھڑے پیو جیو میں اپسیں آپ دکھاوے
ایسی میٹھی معشوق کوں کوئی کیوں دیکھے پاوے
جنہ دیکھے اوسی کوں اسے اور نہ بھاوے
کل شئے محیط ہے اسی کوں پچھانے
جو کوئی عاشق اس پیو کے اسی جیو میں جانے
اسی دیکھت گم ہووے جیسیں میں دیوانے
خواجہ نصیر الدین جنے سائیاں پیو بتائی
جیو کا کھول کنٹھ کھول کر چاکہ آپ دکھائی
رکھے سید محمد حسینی پیو سکہ کما د جائی

•

اے محمد جلوہ جم جم جلوہ تیرا   ذات تجلی ہو گئی سیس پسودہ پھیرا
واحد اپنی آپ تھا اپیں آپ سمجھایا
پر کٹا جلوے کارنے الف میم ہو آیا
حقیقتوں جلوہ دینے کر کاف نون بسایا
لولاک لما خلقت الافلاک خالق پالائے
فاضل افضل جتی مرسل ساجد سجود ہو آئے
امت رحمت بخشش ہدایت تشریف پائے
مخفی نازل معشوق رکھ ظاہر شہباز کلائے
عشق کے جیتی چند بندا اپنی آپ دکھائے
الان کما کان پھر آپسیں آپ سمائے

•

مشکل بازی عشق کی چھوٹے جیو کا نا   سو تو قبل ان تموتو شاہد ہے منا
اونچا مندر ہر عشق کا کوئی کیونکر پاوے
چاروں سرپا جذبہ کر تپے مارتا دے
جی سیس دیوے پانوں تل تو بھی نا پاوے
روئی روئی نا دور کر ایکٹ واحد ہونا
چاروں کپڑے جال کر مجنوں ہو رہنا
پورا مفلس ہووے تو اسے کھیل چت لانا
سو ہے عاشق شہباز ہے دو ہوں جگ کملارا
خواجہ نصیر الدین سائیاں نپت راکھے ہمارا
نسنک کھیل توں پند و عشق کے ہتھ را

اب کچھ بند خواجہ بندہ نواز کی نظم چکی نامہ سے ملاحظہ فرمائیں۔

دیکھو واجب تن کی چکی   پیو چپا تہ ہو کے سکی
سوکی ابلیس کھینچ کھینچ تھکی   کہے یا بسم اللہ ہو ہو اللہ

•

الف اللہ اس کا دستا   بیانے محمد ہو کر بستا
پہنچی طلب یوں دستا   کہے یا بسم اللہ ہو ہو اللہ
دانے ہی سوچن جن لاؤ   شاید ہاتھوں سے لے کر جاؤ
خر لیعت سے چکی بھی آؤ   کہے یا بسم اللہ ہو ہو اللہ

•

الف اللہ اس کا ناتو   پیر مرشد تلک جاتو
پیسو آٹا اس سے چھانو   کہیا بسم اللہ ہو ہو اللہ

•

لام وجود باسن ہونا   اسے تو بسیق دہونا
ذات کہ باقی سوائی گوہنا   کہیا بسم اللہ ہو ہو اللہ

•

سید محمد اکبر حسینی

سید محمد اکبر حسینی دہلی میں ۸۰۲ ہجری میں پیدا ہوئے۔ آپ خواجہ بندہ نواز کے فرزند ارجمند تھے۔ آپ نے بہت چھوٹی عمر پائی۔ اپنے جلیل القدر باپ کی زندگی میں ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ گلبرگہ میں آپ کے والد بزرگوار نے آپ کو خلافت کی خلعت عطا کی۔ لیکن عمر نے وفا نہ کی اور ۸۳۲ ہجری میں انتقال فرما گئے۔ آپ کا مزار گلبرگہ میں ہی ہے مولانا عبدالجبار نے اپنی کتاب تذکرہ اولیاء دکن میں لکھا ہے کہ آپ بڑی خوبصورت نظم اور نثر لکھتے تھے۔ آپ کا کلام تصوف کے رنگ میں ڈوبا ہوا تھا ۱۹۲۸ء میں شائع ہونے والے مجلہ مکتبہ میں مولوی محمد یافعی نے آپ کے کلام کا نمونہ درج کیا ہے۔ نثر و نظم کا نمونہ درج ذیل ہے۔

"سنو اے مسلمانو طالب خدا کے بوجھو زندگی سہل ہے۔ جیوں کا بھروسہ نہیں۔ موجب حکم حضرت علی کے عمل کرو۔ قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ عجلوا بالصلوٰۃ قبل الفوت۔ عجلوا بالتوبہ قبل الموت۔ یعنی شتابی کرو نماز وقت گزرنے سوں۔ آگے ہور شتابی کرو توبہ مرنے سوں آگے یعنی مرید ہو کر توبہ کرنا ہور کفر و ضلالت سوں آپس کو پاک کرنا۔ ایک کے تابع ہو کر خدا طلبی میں عافیت کی راہ سنوارنا اس بات میں حق سبحانہ تعالیٰ قرآن مجید میں کہا ہے۔ اپنے حبیب کو خبر دیا ہے۔ انا ارسلنک۔ جس کوں کو پیر نہیں اسے دین نہیں۔ جسے دین نہیں تو اسے بوجھ نہیں۔ ہور جسے بوجھ نہیں اسے عشق نہیں۔ ہور جسے عشق نہیں اسے صحبت نہیں۔ ہور جسے صحبت نہیں اسے پیر نہیں۔ بے پیر ہو کر رہنا عین کفر ہے۔"

نظم کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

دھو کر زباں کوں اپنی پہلے پیر سوں بیان کر
یوں صفت خدا کا کر شکر میں زبان پر

●

ہے خدا بے صفت اس اس کو نہیں نہایت
کرنے کو تس صفت تو نہیں مجھ زباں میں طاقت
بعد از ثنا خدا کی بھیجوں درود نبی پر
بھی آل پر ... اس کے اصحاب میں
بعد اس کے نام لے کرتا در محی الدین کا
بولو بیان سنو بو حاصل مراد دین کا
بے پیر جھاڑ بوٹے دارو جو لیا حتا تو
ہرگز نہ کھانے اس کوں کر کھائے تو دو اور
بے پیر کے جو ہیں لگے دارو جو کھا جیا کر
بے شک جیا تو جانو اس کو ہوا دو کافر
بے پیر ہیں لگے دارو کھا کر اگر ہوا تو
ایمان سب ہو تس پر مرتا ہے بے ایمان ہو
بے پیر کے جو ہتکا پانی طعام کھا دے
ہو گوشت سور کا اس کوں حرام پاشے

●

بے پیر جو ہوا تو نہیں ہے درست اس پر   پڑھنا نماز جنازہ تو ہوئے گناہ اکبر
بالغ جو انہیں لگ نہ حکم اس پو جانو   بالغ ہوے کے بعد از ہو امر بے سوا تو
بیٹے کوں باپ بولے بیٹا کہے پدر تبلیغ   ہونا مرید جلدی لے کر بجا امر تبلیغ
بیٹے نے ماں سوں کہنا اے مہربان مادر   ہونا مرید شتابی یک لحظہ نا درنگ کر
کوئی پیر پر نہ نا ہو کیتا ایس فنا ہو   پادے مراد حق سوں جو کچھ طلب کرے ہو
سورگ ستی جو کہنا تو بو سخن جلسہ کر   عاقل کے تیں اشارت احتاج بو سوئیں ہے

صدرالدین صوفی

صوفی صدرالدین دکن کے اس علم پرور اور متصوف دور کے بلند پایہ بزرگوں میں سے تھے۔ آپ شاعر بھی تھے اور نثر بھی لکھتے تھے۔ آپ حضرت بدرالدین چشتی کے مرید تھے۔ حضرت بدرالدین چشتی نے آپ کو مسند خلافت سے بھی نوازا تھا۔ شروع شروع میں آپ ناسک میں آ کر آباد ہوئے اور اسی جگہ درس و تدریس کا سلسلہ جاری کیا۔ اس کے بعد دکن کے ایک غیر معروف علاقے پیری میں جا کر بس گئے۔ آپ کا انتقال ۸۷۰ ہجری میں ہوا۔ مولانا عبدالجبار اپنی تالیف تذکرۂ اولیاء دکن میں لکھتے ہیں کہ صدرالدین صوفی صاحب تصنیف تھے اور صاحب طریقت بھی تھے۔ تصوف پر ان کی ایک کتاب بہت مشہور ہوئی۔ اس کتاب کا نام "کسب محویت" ہے اس کتاب میں روح، احدیت، محویت وغیرہم مسائل کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ان کے کلام میں سے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

ناؤں لے اللہ محمد کا اول   کسب کا سب کو کہوں در ہر محل
گوش جان سوں اب سنو صاحب یقین   کیا کہتا ہے نظم میں شہ صدرالدین
اولاً با نفس و دل تطلب شال   خواہش ما نائی کا تو بوجھ حل
کامیاب کوں یہاں نتے ہے راہ وصل   راہ الانفصال ذوالفضل

●

صدرالدین تو کسب پہ ثابت اچھے   صرف سوں صفتوں کے نت ثابت اچھے

●

صدرالدین پل پل میں یوں بیکل ہوا   وصل بھی ایک پل نہیں حاصل ہوا

●

بس کرا اے شہ صدرالدین راز کوں   دید میں دیدار پایا آپس کوں کہوں

نظامی

نظامی کے بارے میں بہت کم معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ خود ان کی نثر اور مثنویوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سلطان احمد شاہ ثالث بہمنی (۸۶۵ھ تا ۸۶۷ھ) کے دور کے شاعر ہیں اور بادشاہ کے دربار میں ہوتے تھے۔ ان کی ایک مثنوی نواب سالار جنگ مرحوم کے مخطوطات میں محفوظ ہیں۔ یہ ایک عاشقانہ موضوع پر لکھی گئی مثنوی ہے۔ اس مثنوی سے اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ نظامی دور بہمنیہ کا شاعر تھا۔

شہنشہ بڑا شاہ احمد کنور   پرتپال سیناد کرتا اوہار
دھنی تاج کا کوں راجا ہنگ   کنور شاہ کا شاہ احمد ہجنگ

●

لقب شہ عسل آل بہمن ولی   ولی تھے بہت بدہ ندا کلی

اس مثنوی کے کچھ اوراق کے فوٹو انجمن ترقی اردو پاکستان کے رسالہ قومی زبان میں چھپے تھے۔ ان میں کئی ایک عنوانات ہیں۔ ایک عنوان یوں ہے۔ "مدح سلطان علاء الدین بہمنی نور اللہ مرقدہ" یہ عنوان اس حقیقت کی طرف واضح اشارہ

کرتا ہے کہ جس زمانے میں نظامی موجود تھا۔ اس زمانے میں سلطان علاؤالدین خلجی انتقال کر چکا تھا۔ نظامی کی زبان بھی بہت ہی پرانی ہے اور اس میں کوئی شک کی گنجائش نہیں کہ یہ دکنی زبان ہی ہے۔ اب تک دکنی زبان کے جس قدر بھی نسخے رسالے اور مخطوطے دریافت ہوئے ہیں۔ ان سب میں سے نظامی کی زبان سب سے قدیم ہے نظامی بادشاہ کا مصاحب بھی تھا اور درباری شاعر بھی تھا۔ قیاس غالب ہے کہ اس کا زمانہ ۵۶۸ ہجری کا ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب دکن کے تخت پر شہزادہ احمد شاہ ثالث براجمان تھا۔ اسی شہزادے احمد کا ذکر شاعر نے اپنے پہلے اشعار میں بھی کیا ہے۔ تاریخ فرشتہ میں احمد شاہ ثالث کو نظام شاہ بہمنی لکھا گیا ہے لیکن اس دور کے سکوں پر بادشاہ کا نام صرف احمد شاہ ہی لکھا ہے۔

نظامی کی یہ مثنوی روایتی انداز میں حمد نعت اور منقبت سے شروع ہوتی ہے اس کے بعد جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے۔ علاؤالدین بہمنی کی مدح ہے۔ اس کے بعد کہانی شروع ہوتی ہے۔ زبان میں عربی اور فارسی کی جگہ ہندی کے الفاظ کثرت سے استعمال کیے گئے ہیں۔ نظامی کی زبان اور بیان اس قدر مشکل اور دقیق ہے کہ سمجھنے اور پڑھنے میں رکاوٹ ہوتی ہے۔ اس کے باوجود نظامی اس دور کا بے مثال شاعر تھا۔ نمونہ کلام حسب ذیل ہے۔

حمد

گسائیں تہیں ایک دنہ جگ دار   برد برمو نہ جگ تہیں دینار
اکاس انچہ پاتال دھرتی تہیں   جہاں کچھ نہ کوئی تھا ہے تہیں

نعت

تہیں ایک ساچا گ میں امر   سری دودی نیں جگ تورا دیر
بٹھایا امولک رتن نور دہر   کوئی دیک جلکٹ کرن راج کر
امولک کلت بیس سنسار کا   کرے کام ندھار کرتار کا

در مدح شہنشاہ

بڑا شاہ وو شاہ جس شاہ جگ   دھین میوتی جرم تے پالے لگ
نہیں شاہ کیہ شاد کس دہرن   گگن ول دہرت ول مستر کرن
شطار دو مستحر ہو اے قلم   مستحر کیا سو رو ے بہت علم
علم گار دشمن سو رچل سراجاؤ   طبل دصول برغون بدل توں بجاؤ
چمکنے لگی جب تک بیتر   چڑھاوا کیا دہرت آکاس پر
چلک بجلی تیوں علم بجو جیون   علم سنگ نخ گرج گگن چپتوں

●

گدم راؤ رکھیں دن دنہ آدھیر   کہ رحمن بات سن بات بک بت دھر
سینا تھا گی نار کی دہری بہت چند   سویں آج دتیا نہ ی جند بند
جات ایک ناگ کجات ایک ساپ   اسکت دہنی کمبیں لانب چانپ
جو کرنا دجگون کیا سوئی راؤ   اسکت کہ کیوں دیکھو سکوں انادر

●

پدم راؤ منیاسا کہ دین   کنڈلی پیراؤ جیا ہود مردین
کچرا تیر ہو جیوں رہیا نہا اوحل   کمان ہو یہ پانچکہ کی پانے تل
اجاسیں باہر کیس بگہ بنات   نہ یون کوئی بوی نہ ناکہ جات
کہ نون ساتچ بیراگ بیٹھ کدم   پدم راؤ کچھو پاؤ کیرا پدم

ملک الشعرا آذری

تاریخ فرشتہ کے حوالے سے پتا چلتا ہے کہ آذری ایران سے چل کر دکن آیا۔ اس نے بہمنی دارالحکومت بیدر میں قیام کیا۔ یہ زمانہ سلطان احمد شاہ بہمنی کا تھا۔ سلطان احمد شاہ نے اسے بڑا درجہ دیا۔ ملک الشعرا کا خطاب دے کر دربار میں بٹھایا۔ آذری نے سلطان کی شان میں بہت سے قصیدے لکھے۔ سلطان نے آذری کو اس کام پر مامور کیا کہ وہ سلطنت بہمنی کی تاریخ لکھے۔ سلطان کے نو تعمیر شدہ محل پر بھی آذری نے ہی یہ قطعہ لکھ کر کندہ کرایا۔

حبذا قصر مشید کہ ز فرط عظمت   آسمان سرو از پایہ ایں درگاہ نیست
آسمان ہم نتواں گفت کہ ترک ادبست   قصر سلطانِ جہاں احمد بہمن شاہ است

تاریخ فرشتہ میں درج ہے کہ سلطان کو بتایا نہ تھا کہ یہ شعر کس نے لکھ کر محل پر کندہ کرائے ہیں۔ ایک بار وہ اس محل میں داخل ہو رہا تھا کہ اس کی نظر قطعے پر پڑی۔ اس نے مصاحبوں سے دریافت کیا کہ یہ اشعار کس کے ہیں؟ اس وقت شہزادہ علاؤالدین بھی شاہ کے ساتھ تھا۔ اس نے کہا یہ اشعار شیخ آذری نے کہے ہیں۔ سلطان ان اشعار کو پڑھ کر بہت خوش ہوا۔ بادشاہ کو خوشی کی کیفیت میں دیکھ کر شہزادے نے عرض کی آذری کو یادِ وطن بہت ستا رہی ہے۔ اسے اجازت دی جائے۔ سلطان نے یہ سن کر کہا کہ اسے چالیس ہزار روپیہ سفر خرچ کے لیے دیا جائے۔

آذری کے آگے جب روپوں کا ڈھیر لگا دیا گیا تو اس نے خوش ہو کر کہا۔

عطایا کم الامطایا کم

سلطان بہت مسرور ہوا اور مزید بیس ہزار روپیہ دینے کا حکم صادر کیا۔ اس کے ساتھ ہی آذری کو شاہی جوڑا دیا گیا اور پانچ غلام دے کر رخصت کیا۔ آذری نے "تاریخ سلطنتِ بہمنیہ" کی ترتیب جاری رکھی۔ اپنی ساری زندگی وہ اس کتاب کو مکمل کرتا رہا۔ اس نے اس کتاب کو یعنی بہمن نامہ کو شاہ سلطان ہمایوں شاہ تک لکھا تھا کہ وہ انتقال کر گیا۔ اس کے بعد ملا نظیری اور ملا سامعی وغیرہ نے اس کتاب کو مکمل کیا۔ آخر یہ کتاب بہمنی حکومت کے خاتمے پر جا کر تکمیل پذیر ہوئی۔

مصنف تاریخ فرشتہ نے اس کتاب کو پڑھا تھا اور اس سے استفادہ بھی کیا تھا۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے۔

> "القصہ بہمن نامہ دکنی تا داستانِ سلطان ہمایوں شاہ بہمنیہ از شیخ آذری بست و بعدہ ملا نظیری و ملا سامعی و دیگر شعرا تا انقراض دولت بہمنیہ ہر کدام کہ توفیق یافتہ اند داستان و حکایت شاہانِ دیگر را الحاق نمودہ در سلک نظم کشیدہ از بہمنی نامہ شیخ آذری گردانیدہ اند۔"

ایک بات اس حوالے سے پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ شیخ آذری نے بہمنی نامہ دکنی زبان میں لکھا تھا۔ ایک اور امر پایۂ تصدیق کو پہنچتا ہے کہ اس عہد میں زبان دکنی یا پراکی اردو بول چال کے مقام سے گزر کر ضبط تحریر میں لائی جا چکی تھی۔ نثر اور نظم دونوں اسی زبان میں حیطۂ تحریر میں آتے تھے۔ اس زمانے میں عام طور پر تصوف پر رسالے زیادہ لکھے گئے ہیں۔ پھر بھی عشقیہ مضامین پر بھی رسالے ملتے ہیں۔ مثنویاں بھی ہیں جن کے پلاٹ عاشقانہ ہیں۔ تاریخ پر بھی اس عہد میں بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ دکنی اردو میں بہت سا کام ہوا اور یہ انہی لوگوں کی کوششیں تھیں کہ اردو زبان بتدریج ترقی کے مراحل طے کرتی چلی گئی۔ اس

حقیقت سے انکار نہیں کہ دکھنی زبان میں ہندی کی آمیزش بہت زیادہ تھی۔ اس وجہ سے بھی کہ یہاں جو لوگ باہر سے آئے، ان میں عرب کم بہت کم تھے۔ اگر تھے تو وہ شمالی ہند کو واپس کوچ کر گئے تھے۔

اردو پر عربی کا اثر

جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ ہندوستان میں ظہورِ اسلام سے پہلے بھی عرب تاجر تجارت کی غرض سے اپنے بحری جہازوں پر طویل سمندری سفر طے کر کے آیا کرتے تھے اور عربی نے اس زمانے کی اردو پر اپنا اثر ڈالنا شروع کر دیا تھا۔ یہ اثرات مالابار کے ساحل اور کرناٹک میں زیادہ نمایاں تھے۔ کیونکہ عرب سوداگروں کے جہاز اسی جگہ آ کر لگتے تھے۔۔۔ ظہورِ اسلام کے بعد عرب سوداگروں نے اپنے دین کی باتیں بھی شروع کیں تو قرآن شریف کی آیات کا ذکر بھی آیا۔ عربوں کو اپنی زبان پر بجا طور پر فخر تھا۔ کیونکہ اس زبان میں وہ اپنے خیالات کو جس جامعیت اور معنویت کے ساتھ ادا کر سکتے تھے وہ کسی دوسری زبان میں اتنی آسانی اور تکمیل کے ساتھ ادا نہیں ہو سکتے تھے۔ چنانچہ عرب مبلغین اور سوداگر اس اصول پر سختی سے پابند تھے کہ اصول دین کے ارکان عربی میں ہی ادا کئے جائیں۔ نماز کسی دوسری زبان میں نہیں ادا کی جا سکتی۔

عرب سوداگر یا مبلغ جب وقت اپنے ملک سے باہر نکلے تو ان کا دین اور زبان مکمل ہو چکی تھی۔ اس لیے دوسرے ملک میں اب ان کے انقلاب پذیر ہونے کا اندیشہ نہ تھا۔ ہندوستان میں بھی آ کر انھوں نے تقریر و تبلیغ کے لیے عربی ہی کو ذریعہ بنایا۔ ہاں کہیں کہیں فارسی زبان بیچ میں شگوفہ ضرور بن گئی۔ یہی وجہ ہے کہ اردو ادب لسانی اور فنی اعتبار سے تو فارسی سے متاثر ہوا لیکن جہاں تک ایمان و اخلاق کا تعلق ہے اس کا سرچشمہ عربی زبان ہی رہی۔ دین اور اخلاق نے جو ایک بے مثال ذخیرہ اردو ادب کو دیا اس کے لیے ہمیں بنیادی طور پر عربی زبان کا ممنون ہونا پڑتا ہے۔ قرآن و حدیث کے مختلف مسائل اور تفسیر کے بیان سے اردو کا دامن مالا مال ہوا۔ فارسی اور اردو میں شعرا کی تعداد ہمیشہ سے زیادہ رہی ہے اس لیے ہندوستان کے ہر دور میں عرب کے حالات اور عربی کے واقعات بہت حد تک اردو زبان میں جگہ پاتے رہے۔ باہر سے تبلیغی مواد اور بزرگانِ دین بھی یہاں آ کر برابر تبلیغ کرتے رہے۔ اس طرح سے بعد میں چل کر اردو شعر کے اصناف نے بھی بہت گراں بہا اضافہ پایا۔ خاص طور پر واقعات کربلا سے مرثیے نے اردو زبان میں ایک بلند ترین مقام حاصل کیا۔

اردو کے مذہبی دفتر میں آپ کو اکثر عربی کے جملے، ضرب الامثال محاورے اور جا بجا ملیں گے۔ بلکہ وہ ہماری اردو نثر کا جزو بن گئے ہیں۔ آج بھی ہم یہ عربی محاورے ضرب الامثال اور جملے یوں آسانی سے استعمال کرتے ہیں کہ ہمیں کانوں پر ہرگز گراں نہیں گزرتیں اور نہ ہی اردو کے لیے یہ کوئی اَنمل بے جوڑ بات معلوم ہوتی ہے۔ دینی احکام اصلاً عربی میں تھے۔ چنانچہ وہ من و عن اسی شکل میں اردو میں آ گئے۔ غالباً ان کی جامعیت، بلاغت اور معنویت کے اعتبار سے فارسی اور اردو کے علما نے انھیں اسی شکل میں باقی رکھا۔ اردو زبان پر عربی کا یہ اثر بھی کوئی معمولی اثر نہ تھا کہ ان کی محبت اور بزرگانِ دین سے عقیدت مندی اور رب العالمین کی رحمتوں کے اعتراف کی بنا پر مسلمانانِ ہند نے اپنے بچوں کے نام ایسے رکھنے شروع کر دیئے جو عربی زبان میں تھے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ اردو زبان میں عربی کے الفاظ آتے چلے گئے اور پڑھے لکھے لوگوں کی زبانوں پر بھی چڑھتے رہے۔

اردو زبان میں تبلیغ دین کا بے پایاں کام کیا گیا۔ آج بھی تبلیغ دین کے لیے اردو اور عربی ساتھ ساتھ استعمال کی جاتی ہے۔ چنانچہ ارکانِ دین کے سلسلے میں جو الفاظ عربی زبان کے سانچے سے نکلے تھے وہ اردو زبان کے سانچے میں آ کر ڈھل گئے۔ ان میں سے بعض الفاظ نے تو مستقل طور پر اردو کا لباس پہن لیا۔ مثلاً توکل، معرفت، راہِ سلوک، نفسِ امارہ، قناعت، حرم، رضائے الٰہی، صبر، یدِ بیضا، احرام، بیعت، افطار، روزہ، وغیرہ۔ عربی زبان نے اشاعتِ دینِ اسلام کے سلسلے میں اردو کے دامن کو گلہائے رنگا رنگ سے مزین کیا۔ عربی زبان کئی انداز میں اردو زبان پر اثر انداز ہوئی۔ اگر ہم محققانہ انداز میں تاریخ پر روشنی ڈالیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ہندوستان میں قدیم زمانے میں فارسی اور عربی دونوں زبانیں آپس میں گھل مل گئی تھیں۔ فارسی نے بہت کچھ صرف و نحو، خیالات، الفاظ، اصنافِ سخن، بحور وغیرہ عربی سے لے کر اپنا دامن بھرا تھا اور جب وقت آیا تو اردو نے بہت سی چیزیں فارسی سے لیں۔ چنانچہ عربی نے بلا واسطہ زیادہ فائدہ اردو کو اگر نہیں پہنچایا تو بالواسطہ ضرور پہنچایا۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اردو میں جو مشکل اور ادق الفاظ رائج ہیں وہ عربی زبان کے ہیں اور جو آسان الفاظ ہیں وہ فارسی زبان کے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ نہ تو فارسی میں سارے کے سارے الفاظ مشکل ہیں۔ اور نہ عربی میں سارے الفاظ ہی ادق ہیں۔ دونوں زبانوں میں آسان اور ثقیل الفاظ مل جاتے ہیں۔ اردو زبان نے ان دونوں بلیغ زبانوں سے استفادہ کیا اور اپنے دامن کو ان کے گوہر ہائے گراں مایہ سے بہرہ ور کیا۔ اصطلاحی الفاظ ہر شعبہ میں اردو نے فارسی کی بجائے عربی سے زیادہ لیے۔ آسان اردو بغیر فارسی کی آمیزش کے لکھنا بہت مشکل ہے، سید انشا کی طرح "داستان رانی کیتکی کی اور اودے بھان کی کہانی" ایسے قصے خالص اردو کا نام رکھ کر بغیر عربی الفاظ کے بڑی محنت سے لکھے جا سکتے ہیں لیکن اس طرح سے بلند خیالی اور زبان کی عظمت ضرور مجروح ہوتی ہے۔ کیونکہ اردو زبان کی نشو و نما میں اور تخیل کی بلندی کو ادا کرنے میں فارسی اور عربی زبان نے ہماری بڑی مدد کی ہے۔ چنانچہ ان کو الگ کر کے کم از کم اردو میں فکر و فن کی بلندیوں کو چھونا مشکل ہے۔

اس کے برعکس ہماری عام زندگی اور عام بول چال میں عربی فارسی کے لفظ اس طرح سے آ گئے ہیں کہ ہمیں احساس تک نہیں ہوتا کہ ہم عربی کا ایک دقیق لفظ بڑی آسانی سے ادا کر گئے ہیں۔ ذیل کے الفاظ دیکھیے۔ یہ نہایت دقیق عربی الفاظ ہیں۔ لیکن ہم بڑی روانی سے آپس کی بول چال میں دن میں سینکڑوں بار بولتے ہیں۔ مثلاً۔

معنی۔ مطلب۔ قمیص۔ قلم۔ محفل۔ مجلس۔ وصول۔ فیصلہ۔ اعتراض۔ حکیم۔ حضوری۔ حاضری۔ امتحان۔ شیطان۔ شریر۔ مذہب۔ حلوا۔ تعصب۔ فرش۔ مزاج۔ مبارک۔ مراد۔ تقدیر۔ تدبیر۔ مستقل۔ استقلال۔ شوق۔ دکان۔ لفافہ۔ علاج۔ نسخہ۔ تمیز۔ شعور۔ وزیر۔ عزت۔ ذلت۔ مقدمہ وغیرہ۔ اس قسم کے بے شمار لفظ ہیں جو عربی سے نکل کر اب اردو کا ایک حصہ بن گئے ہیں۔ اگر ہم ان میں وہ الفاظ بھی شامل کر دیں جو فارسی ترکیب اور لفظ کے ساتھ مل کر آئے ہیں تو تعداد بڑھ جائے گی۔ ایسے الفاظ اور تراکیب جیسا کہ ــ بدکردار۔ بدمعاش۔ بے وقوف۔ بے خبر۔ عدم ناآشنا۔ صلح پسند۔ صاحب فہم بے ایمان۔ نالائق اور بے وفا وغیرہ۔ اسی طرح طب۔ نجوم۔ صرف و نحو۔ ریاضی۔

فنون لطیفہ، علم ہیئت، موسیقی، فلسفہ کی اصطلاحات بھی براہ راست عربی سے اردو میں منتقل ہو گئیں۔ عربی زبان کے ساتھ ایک برتری کا پہلو یہ بھی تھا کہ اس زبان میں کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ مفہوم ادا کرنے کی جو صلاحیت تھی وہ فارسی میں نہیں تھی اور نہ برج بھاشا میں تھی۔ عربی میں ایک ہی لفظ میں تھوڑی سی تبدیلی سے فاعل مفعول سب کچھ بن جاتے ہیں۔ ایک حرف کے بڑھا دینے سے اسم ظرف، اسم آلہ بن جاتے ہیں اور موضوع کے اعتبار سے ہر لفظ اپنے مادے سے منسلک رہتا ہے۔ اور یوں مفہوم سے ذہن بھٹکتا نہیں۔

چنانچہ عربی کے جو الفاظ کسی خاص شعبہ میں مستقل حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ انہیں اسی طرح سے اردو میں داخل کر لیا گیا۔ یوں اردو کا دامن وسیع سے وسیع ہوتا گیا۔ اردو ایک بالکل نئی زبان تھی لیکن اس نے اپنے رشتے ان زبانوں سے جوڑے تھے جنہوں نے زمانے کے کئی گرم سرد دیکھے تھے۔ جو بڑے بڑے انقلابوں سے گزر چکی تھیں۔ چنانچہ تلمیحات کی تلاش میں اسے ادھر ادھر مارے مارے پھرنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ اس سلسلے میں عربی نے اردو کی سب سے زیادہ مدد کی۔ قدامت کے علاوہ اردو زبان کے اکثر و بیشتر ادیب، مصنف اور سرپرست مسلمان تھے جن کا دین عرب کی سرزمین سے پیدا ہوا تھا اور اس زبان کے مبلغین سے ان کا روحانی واسطہ تھا۔ وہاں کے واقعات، کردار اور فلسفہ اپنے آپ اردو کے دامن میں ڈھلتے چلے گئے۔ جس سے زبان کی معنویت میں اضافہ ہوئی۔ مثلاً ذیل کی تلمیحات ملاحظہ فرمائیں۔

"ابلیس۔ اخوانِ یوسف۔ آدم و حوا۔ ارنی۔ صور اسرافیل۔ لن ترانی۔ اسم اعظم۔ اصحاب فیل۔ اصحاب کہف۔ زمزم۔ لوح۔ اہرام مصر۔ بیت الحزن۔ تابوت موسیٰ۔ خضر۔ حاتم۔ خندق۔ خیبر۔ ذوالفقار — شمس الضحیٰ۔ سدرہ۔ حجر اسود۔ شداد۔ نمرود۔ لولاک لما۔ کن فیکون۔ شق القمر۔ سرمد۔ طوبیٰ۔ غار حرا۔ ہاروت ماروت۔ حسینؑ۔ دجلہ و فرات۔"

اور اس نوع کے بہت سے کنایات و واقعات، اسما اردو کی تلمیحات میں جگہ پا کر رائج ہوئے۔ ✓

اُردو پر عربی قواعد کا اثر

اگر ہم یہ کہیں کہ ہماری اردو زبان میں حروف تہجی کا وجود ہی عربی زبان کی وجہ سے قائم ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ الف سے ے تک پڑھ جائیں۔ آپ کو نوے فی صد حروف عربی کے ملیں گے۔ بعد میں دوسری زبانوں یعنی بھاشا اور فارسی نے اردو پر اثر ڈال کر مختلف آوازوں کو مکمل کرنے کی کوشش کی۔ اس لیے ہم یہ بات بلا خوف و خطر کہہ سکتے ہیں کہ اردو زبان کا سنگِ بنیاد عربی نے رکھا۔ بعد میں ابجد ہوز کے اعداد بھی اردو نے عربی زبان ہی سے لیے۔ جس کی وجہ سے ہزاروں قطعات تاریخ ہماری شاعری میں آج تک مختلف عہد اور تاریخ کے واقعات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ دوسری طرف عربی صرف و نحو کے قواعد کا اثر اردو پر برائے نام سا ہے۔ اردو کی تانیث و تذکیر، واحد جمع، اسم فاعل، اسم ظرف وغیرہ عربی کے سانچے میں نہیں اتر سکے۔ لیکن جب ہم علم بدیع، علم بیان، علم معانی پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ اردو پر عربی اثرات کس قدر گہرے ہیں۔ جو ضابطے اور قاعدے لسانی اعتبار سے عربوں نے ترتیب دیئے تھے، ویسے کے ویسے فارسی والوں نے ان سے لیے اور ان سے لے کر اردو والوں نے اپنی معنویت اور جامعیت میں اضافہ کیا۔ اردو شاعری میں بحریں اور ارکان براہ راست عربی سے نہیں آئے۔ اس نے فارسی والوں سے ان کو پایا مگر یہ بحور خود فارسی نے عربی سے لیے تھے اور انہی بحور سے فارسی اور اردو والوں نے اپنی شاعری کے اوزان کو درست کیا۔

فارسی کی مانند عربی نے بھی اردو کی ساخت کو محاوروں اور تراکیب اور ضرب الامثال سے مکمل کیا۔ اگرچہ اس سلسلے میں اردو نے اتنا فائدہ نہیں اٹھایا جتنا فائدہ فارسی نے حاصل کیا۔ پھر بھی عربی کے محاورے اور ضرب الامثال اور ترکیبیں پوری طرح سے اردو پر اثر انداز ہوئیں۔ چند الفاظ اور تراکیب پیش خدمت ہیں۔

"مخبوط الحواس۔ رقیق القلب۔ لاابالی۔ مغلوب الغضب۔ کالعدم۔ فی الحال۔ فی الفور۔ بالفرض۔ خالی الذہن۔ بالغ النظر۔ بادی النظر۔ ذوی الاحترام۔ لیل و نہار۔ عزوجل۔ نعم البدل۔ صادق القول۔ ستم ظریف۔ نقش کالحجر وغیرہ"

اس اعتبار سے فارسی اور اردو دونوں زبانوں نے ہی عربی زبان سے پورا پورا استفادہ کیا۔ بعض محاورات اور تراکیب تو دونوں میں یکساں طور پر نظر آتی ہیں۔ مگر مجموعی لحاظ سے اگر ہم دیکھیں اور تحقیق کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ دینی فکر، عروض، علم بدیع و بیان اور فلسفہ و حکمت کے سلسلے میں فارسی کی نسبت اردو زبان میں الفاظ زیادہ آئے۔ فارسی سے ہم نے مضامین ضرور حاصل کیے۔ مثلاً طرز تخیل، اصناف سخن، طرز گفتار، عشق و محبت کے نظریات وغیرہ کے سلسلے میں اردو ادب پر فارسی کی چھاپ صاف پہچانی جائے گی۔ لیکن ایک بات ہمیں بار بار اپنا احساس دلاتی ہے وہ یہ کہ اردو نے براہ راست عربی سے بہت کم حاصل کیا۔ اس نے جو کچھ حاصل کیا وہ فارسی کے واسطے سے حاصل کیا۔ عربی سے بہت کچھ حاصل کرنے کے بعد فارسی نے عربی کی خصوصیات اور نیز اپنی ذاتی خصوصیات سب کچھ واپس اردو کی جھولی میں ڈال دیا۔

قدیم ہندوستان کی بھاشا

یہ ایک فطری بات ہے کہ انسان تو کسی فاتح کے آگے جھک سکتا ہے لیکن زبان اور خیالات اگر چاہیں تو ایسا نہیں کر سکتے۔ بلکہ ایسا نہیں ہوتا۔ زبان اور خیال باہر سے آنے والے فاتحین کا ضرور مقابلہ کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب مسلمان باہر سے اپنی زبان اپنی روایات اور طرز معاشرت، اصول لسانیات لے کر ہندوستان میں فاتح بن کر آئے تو یہاں کی بھاشا نے ان کی زبان میں گھل مل جانا پسند نہ کیا اور اپنے آپ کو سب سے الگ تھلگ رکھنے کی کوشش کی۔ جب ہم اردو کے اجزائے ترکیبی پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں اس پر ہندوستان کے سماج اور اس کی ضرورتوں کا فطری ردِ عمل صاف معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اردو زبان کی فطرت اسی سرزمین سے وابستہ تھی۔ اس کا خمیر ہندوستان کی مٹی سے اٹھا تھا۔ اس اعتبار سے جب ہم اردو زبان کی تخلیق اور ساخت پر غور کرتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ اردو زبان کے قواعد اسی سرزمین کی زبانوں مثلاً برج بھاشا، کھڑی بولی یا پنجابی وغیرہ سے مرتب ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ اس زبان کے سارے کے سارے افعال ہندوستانی ہیں۔ اگرچہ کچھ نہ کچھ اس سلسلے میں فارسی سے بھی مدد لی گئی ہے لیکن باقی سارے کے سارے فعل بھاشا سے لیے گئے ہیں۔ اسما اضافت بھی بھاشا ہی سے آئے ہیں

محاورے بھی بھاشا سے بہت سے لیے گئے ہیں۔

بھاشا نے قواعد کے تمام مطالبات خود پورے کر دیئے۔ بھاشا نے شروع ہی سے اپنی الگ حیثیت کو برقرار رکھا تھا۔ فعل، اسم، صفت، اسم فاعل، مفعول، ضمیر اور اسم ظرف وغیرہ بہت کچھ مہیا کر لیا۔ اس نے کسی دوسرے قواعد کے سانچے میں ڈھل کر اپنی حیثیت کو کمزور کرنا بالکل گوارا نہ کیا۔ بلکہ الٹا دوسری زبانوں کو اپنی راہ پر لا کر ان سے کام نکال لیا۔ اردو نے عربی یا فارسی کے قاعدوں سے اپنے لفظوں کا اسم فاعل، مفعول اور اسم ظرف وغیرہ نہیں بنایا۔ اس نے شروع ہی سے اپنا ایک الگ اصول رکھا۔ مثلاً اسم فاعل بنانا ہو تو مصدر کے الف کو یے سے بدل کر "والا" بڑھا دیا۔ جیسے پینے سے پینے والا جانا سے جانے والا۔ اسی طرح سے اسم مفعول بنانے کے لیے پہلے مصدر کا ماضی بناتے ہیں اور پھر آخر میں "ہوا" زیادہ کر دیتے ہیں۔ مثلاً ابلنا سے ابلا ہوا۔ لوٹنا سے لوٹا ہوا۔ یوں اردو نے اپنا ہر اصول فارسی اور عربی کے ضابطے سے آزاد ہو کر بنایا۔ اس کے علاوہ دوسری زبانوں کے الفاظ کو اپنی زبان کے تقاضوں کے مطابق وضع کر لیا۔ جیسے استاد کی جمع استادوں۔ کرامت کی جمع کرامتوں بنا لیا وغیرہ وغیرہ۔

اردو زبان نے اپنی ابتدا ہی سے اس بات کا ثبوت دے دیا تھا کہ اس میں اتنی طاقت ہے کہ وہ خود اپنے بل بوتے پر دوسری زبانوں کی جائز حد تک خوشہ چینی کر کے اپنی ساخت پرداخت کر سکے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس زبان نے اپنی تشکیل اور ترقی کے لیے سارا ساز و سامان اسی سرزمین سے حاصل کیا لیکن اردو نے اپنے دامن کو سمیٹا نہیں۔ بلکہ اسے کھلا رکھا۔ دوسری زبانوں سے جو چیز اپنی حیثیت کو برقرار رکھتے ہوئے لی جا سکتی تھی اسے بڑی فراخ دلی سے قبول کیا۔ چنانچہ قواعد کے سلسلے میں دوسری زبانوں سے خاص خاص چیزیں اردو زبان میں آ گئیں۔ لیکن اردو نے ان زبانوں کے الفاظ میں زیادہ تر ان ہی کے اصول استعمال کیے۔ یعنی عربی فارسی الفاظ کی جمع، اسم ظرف، اسم آلہ، اسم فاعل وغیرہ ان ہی زبانوں کے اصولوں کے مطابق بنا کر پیش کیے۔

روز اول ہی سے اردو کو برصغیر پاک و ہند میں ایک مرکزی حیثیت حاصل ہونا شروع ہو گئی تھی۔ یہ ایک نقطہ تھا جس کے گرد یہاں کی ساری زبانیں اور باہر سے آنے والی زبانیں گھوم رہی تھیں۔ اس زبان میں کچھ ایسی کشش تھی کہ دوسری زبانوں کے الفاظ خود بخود اس زبان کی طرف کھنچے چلے آتے تھے اور اس کے خزانے کو مالا مال کر رہے تھے۔ چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے اس زبان میں پنجابی، عربی، فارسی، دکھنی، سنسکرت، ترکی، ہندی اور پرتگالی وغیرہ کے ہزاروں الفاظ شامل ہو گئے۔ اردو میں تمدنی پذیری اور وسیع القلبی موجود تھی وہ ہر قوم اور ہر زبان کے الفاظ اپنی ضروریات کے مطابق حاصل کر لیتی تھی۔ اس سلوک کا یہ اثر ہوا کہ بھاشا نے اپنے سارے الفاظ اردو کی جھولی میں ڈال دیئے۔ یہ وہ الفاظ تھے کہ جن کے بغیر کوئی بھی زبان زبان نہیں کہلا سکتی بلکہ گونگی بہری بن کر رہ جاتی ہے۔ ہمیں ان لوگوں کا شکر گزار ہونا چاہیے جنہوں نے شروع شروع میں سمندر کے کنارے بیٹھ کر ضروریات زندگی کو ادا کرنے والے بے شمار استعمال بنائے اور بھاشا سے بھی حاصل کیے۔ مثلاً ہندوستان میں سب سے ضروری شے کاشت کاری تھی۔ یہ ملک بنیادی طور پر ایک زرعی ملک تھا۔ اس کے متعلقات کے لیے الفاظ کا ہونا ضروری تھا۔ چنانچہ بھاشا نے اپنے انس سے اردو کو الفاظ مہیا کر دیئے۔ زراعتی سامان کے لیے لفظ تلاش کیجیے تو آپ کو بڑی آسانی سے یہاں ان الفاظ کا ایک ذخیرہ مل جائے گا۔ مثلاً ہل، بیل، کھیت، جوتنا، بونا، پانی دینا، گوڑی کرنا، کھلیان۔ غلہ کو الگ الگ سمجھانے کے لیے کتنے ایسے الفاظ ہیں۔ مثلاً گیہوں، جو، چنا، مٹر، ارہر، مونگ، باجرا وغیرہ۔

ترکاری اور پھلوں کے نام بھی بھاشا ہی سے لیے گئے جیسے دھنیا، پالک، مولی، گاجر، آلو، آم، امرود، کیلا، جامن۔ لیکن جو چیزیں ہندوستان سے باہر سے آتی تھیں ان کے نام ویسے کے ویسے ہی رہنے دیئے۔ کپڑوں اور لباس میں بھی اردو نے بھاشا سے استفادہ کیا مثلاً دھوتی، کرتہ، بنڈی، لنگوٹ، ٹوپی، پگڑی، انگرکھا، دوپٹہ، انگیا، کرتی، لہنگا، جوتا، جوتی وغیرہ۔ آپ اپنے جسم کو دیکھیں تو آپ کو اس کے ہر عضو کے لیے اردو میں بھاشا زبان ہی کا کوئی لفظ ملے گا۔ جیسے پاؤں، ہاتھ، پیٹ، کلیجہ، پیٹھ، پھیپھڑا، گرگوا، دانت، ناک، کان، منہ، مسوڑا وغیرہ۔

کھانے پینے کے آلات کو دیکھیں تو یہاں بھی ہمیں بھاشا کے الفاظ کا ذخیرہ ملتا ہے۔ مثلاً چولہا، ہانڈی، توا، ڈوئی، کڑچھل، بیلنا، ملہا وغیرہ۔ اور ان کو گرم کرنے کے لیے بھی اپنے لفظ دیئے جیسے لکڑی، دیا سلائی، آگ، انگارہ، چنگاری وغیرہ۔ کھانے کی چیزوں کے نام بھی بھاشا نے دیئے جیسے آٹا، روٹی، دال، پوری، کچوری، گھی، تیل۔ زندگی کی تمام بنیادی ضرورتوں کے مفہوم کو ادا کرنے کے لیے سارے کے سارے الفاظ بھاشا نے دیئے اور اردو کو اس لائق بنایا کہ وہ ایک مکمل زبان کہلانے کی حقدار ہو سکے۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ عربی فارسی کے کافی الفاظ تلفظ کے اعتبار سے یہاں آ کر ویسے نہ رہے۔ انگریزی الفاظ کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ مثلاً انگریزی کی لینٹرن یہاں آ کر لالٹین، کول، کوئلہ اور رپورٹ محض رپٹ بن کر رہ گئی۔

اردو کی خدمات کے سلسلے میں بھاشا کی فہرست بڑی طویل ہے۔ فارسی کے محاوروں کو کبھی کبھی ترجمہ کر کے اردو میں لایا جاتا رہا۔ مگر بھاشا سے تو بے شمار محاورے، تلمیحات اور ضرب الامثال اردو میں آئیں اور یوں یہ زبان روز بروز ترقی کرتی چلی گئی۔ اس لحاظ سے اردو کی خدمت میں بھاشا کا پلہ عربی اور فارسی سے بھاری ہے۔ ہندی بھاشا کا اثر اردو کے صرف خاص شعبوں میں ہی نہیں بلکہ سرزمین ادب پر بھی ہوا۔ ہو سکتا ہے یہ کہا جائے کہ یہ بھاشا کا نہیں بلکہ یہاں کی سرزمین کا اثر تھا۔ مگر یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ مسلمان یہاں فاتح بن کر آئے وہ بڑے فراخ دل اور وسیع القلب تھے۔ وہ علم دوست تھے۔ ان کی نظر کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ وہ اگر اپنی زبان کی روایات ساتھ لائے تھے تو یہاں کی زبانوں سے بھی بے خبر نہیں رہ سکتے تھے۔ چنانچہ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ مسلمانوں نے یہاں سنسکرت اور بھاشا سے خاصی دلچسپی لی۔ خلیفہ ہارون الرشید کے زمانے میں ہندوستان سے پنڈت بلائے گئے۔ سنسکرت سے کتابیں ترجمہ کرائی گئیں۔ ملک محمد جائسی نے "پدماوت" ایسی بے مثال نظم بھاشا زبان میں کہی تھی۔ امیر خسروؒ کا کلام بھاشا زبان میں بھرا پڑا ہے۔ عبدالرحیم خان خاناں کا بیشتر کلام نظم و نثر اسی زبان میں ہے۔ دارا شکوہ نے اپنشدوں کا ترجمہ فارسی میں کیا تھا۔

چنانچہ اردو زبان کے تشکیل پذیر ہونے کے بعد بھاشا کے جذبات کسی قدر تبدیلی کے ساتھ اردو کے مزاج کا حصہ بنتے چلے گئے۔ عربی فارسی کے دروازے تو اردو پر پہلے ہی کھل چکے تھے اب بھاشا نے بھی سنسکرت اور دوسری بولیوں سے خوشہ چینی کر کے اردو کے دامن کو بھرنا شروع کر دیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے رسم و رواج، دریا، پہاڑ، پرندے اور بزرگان دین کے واقعات کو شاعروں نے

اپنے کلام میں سمونا شروع کر دیا جس کے بہترین نمونے ہمیں شروع شروع میں کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ میں ملتے ہیں۔ بہت بعد میں جا کر ہمیں ایسی مثالیں سودا۔ اور میر کے علاوہ نظیر اکبر آبادی میں بدرجہ اتم ملتی ہیں۔ بھاشا نے ہندوستان میں آنے ہوئے ان شاعروں پر بھی اپنا اثر ڈالا جو ایرانی النسل تھے۔ مثلاً امیر خسروؒ نے دیول رانی۔ خضر خان کے نام سے ایک مکمل مثنوی لکھی۔ شاہی محل کے شاہی باغ کی تعریف کرتے ہوئے ہندوستانی پھولوں کا ذکر خاص طور پر کرتے ہیں۔ گل کوزہ اور گلِ صد برگ کی تعریف کرنے کے بعد امیر خسروؒ لکھتے ہیں کہ یہ دونوں پھول ہندی نژاد ہیں۔

ازیں سو بیل پیشانی کشادہ　　بہ یک گل ہفت گل بر ہم نہادہ
وزاں سو دل ربائے عاشقاں جائے　　ہمہ تن بہر دلہا راشدہ جائے

اسی طرح وہ کیوڑہ، چمپا، مدسری، سیوتی وغیرہ پھولوں کی بھی بے حد تعریف کرتے ہیں۔ امیر خسروؒ نے ہندوستان کی ان رسموں اور کھیل تماشوں کا بھی ذکر کیا ہے جو اس زمانے میں یہاں رائج تھے۔ مثلاً نٹوں کا تماشا، شعبدہ بازوں کے کھیل، گیند کا آسمان میں اچھالنا، تلوار نگل جانا، ناک کے راستے چاقو چڑھا لینا، بہروپیوں کے سانگ ولایتی اور ہندوستانی راگ اور باجے۔ ہندوستانی گانے والیوں کے ناچ اور رنگ کی محفلیں۔ غرض کہ اس طرح کی بے شمار باتیں ہمیں امیر خسروؒ کی اس مثنوی میں ملیں گی۔

اردو نے اپنے ہاں بے شمار اصنافِ سخن کو جگہ دے کر اپنی زبان کو وسیع تر بنانے کی کوشش کی۔

بزرگانِ دین اور اردو

دینِ اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لیے مسلمان فاتحین سے پہلے بھی عرب تاجر یہ خدمت سر انجام دے رہے تھے چنانچہ مالا بار اور لنکا دیپ کے جزائر میں پرانی مسجدیں ابھی تک اس حقیقت کی گواہ ہیں۔ عرب سوداگروں کا اٹھنا بیٹھنا، بات کرنا اور تجارت کرنا عین اسلام کے مطابق تھا۔ چنانچہ یہاں کے لوگ ان کے عمل سے متاثر ہو کر مسلمان ہونا شروع ہو گئے تھے۔ اس کے بعد مسلمان فاتح بن کر ہندوستان میں داخل ہوئے تو ان کے بعد بزرگانِ دین بھی تشریف لائے۔ دینِ اسلام کی اشاعت کے ساتھ ساتھ اردو زبان کی ترقی و ترویج میں بھی نمایاں کردار ادا کیا۔ انہوں نے اپنے نورِ باطن سے اہلِ ہند کے سینوں کو منور کیا۔ انہوں نے لکھا فارسی یا عربی میں لیکن کلام یہاں کی زبان میں کیا۔

حضرت داتا گنج بخش علی ہجویریؒ غزنوی دورِ حکومت میں لاہور تشریف لائے۔ آپ کا انتقال ۱۰۶۳ عیسوی میں لاہور ہی میں ہوا۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ راجہ پرتھوی راج چوہان کے عہد میں اجمیر شریف تشریف لائے۔ ملک محمد جائسی کی نظم الکھروتی کی شرح بیان کرنے والا لکھتا ہے۔

"گماں مکنند کہ ہیچ اولیا اللہ بزبانِ ہندی تکلم نکردہ۔ زیرا کہ اول از جمیع اولیاء اللہ قطب الاقطاب خواجہ بزرگ معین الحق قدس اللہ سرہ بدیں زبان سخن فرمودہ۔"

حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی تشریف آوری کا زمانہ قطب الدین ایبک کا زمانہ ہے۔ آپ خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ کے خلیفہ اور بابا فرید شکر گنجؒ کے پیر و مرشد تھے۔

حضرت بابا فرید شکر گنجؒ۔ آپ نے خاندانِ غلاماں کے دورِ حکومت میں پاک پٹن شریف کو اپنا مسکن بنایا۔ بابا صاحب جس دور میں پنجاب تشریف لائے اس وقت پنجاب اور ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کو قائم ہوئے کوئی دو سو برس کا عرصہ گزر چکا تھا۔ اردو زبان تشکیل پذیر ہو کر ایک خاص شکل میں سامنے آ چکی تھی اور اس کا رواج عام ہو چکا تھا۔ آپ نے حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ سے فیض پایا۔ اور پاک پٹن شریف میں چشمۂ فیض جاری کیا۔ آپ یہاں کے لوگوں کو ہندی زبان میں ہی تبلیغ و تلقین فرماتے تھے۔ آپ چونکہ بہت بڑے بزرگ تھے اور سرچشمۂ فیض تھے اس لیے تقریباً ان کے دوسرے اولیاء اللہ اور بزرگانِ دین سے زیادہ اقوال اور اشعار موجود ہیں۔ آپ پنجابی زبان میں بھی شعر اور بیت دوہے موزوں فرماتے تھے۔ سید مبارک مؤلف سیر الاولیاء اپنی تالیف میں بابا صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"شیخ شیوخ العالم قدس سرہ العزیز یعنی حضرت بابا فرید شکر گنجؒ فرمودہ بزبان ہندی "پونوں کا چاند بھی بالا ہے" یعنی ماہِ شبِ چہاردہم در اول شب خورد می باشد کہ بتدریج بکمال می رسد۔"

بابا صاحب کے کلام کا نمونہ ایک بیاض کے قدیمی نسخے میں یوں درج ہے۔

تن دھونے سے دل جو ہوتا پاک　　پیش رو اصفیا کے ہوتے غوک
ریش بلعنت سے گر بڑے ہوتے　　بو کڑوں سے نہ کوئی بڑے ہوتے
خاک لانے سے گر خدا پائیں　　گائے بیلاں بھی واصلاں ہو جائیں
عشق کا رمز نیارا ہے　　جز مدد پیر کے نہ چارہ ہے

اس دیوان میں ایک غزل ریختہ میں درج ہے۔

وقتِ سحر وقتِ مناجات ہے　　خیز در آں وقت کہ برکات ہے
نفس مبادا کہ بگوید ترا　　خسپ چہ خیزی کہ ابھی رات ہے
باتنِ تنہا چہ روی زیرِ زمیں　　نیک عمل کن کہ وہی سات ہے
پند شکر گنج بدل جاں شنو
ضائع مکن عمر کہ ہیہات ہے

علاوہ بریں آپ کا پنجابی کلام پنجاب میں آج بھی زبانِ زدِ خاص و عام ہے پنجابی کے دوہوں میں فرماتے ہیں۔

اٹھ فریدا ستیا تیری داڑھی آیا بور　　اگاں نیڑے آگیا تے پچھا رہ گیا دور
اٹھ فریدا ستیا نے جھاڑو دے سیت　　توں ستا تے رب جاگدا تیری ڈاہڈے نال پریت

حضرت خواجہ بو علی قلندرؒ پانی پتی

حضرت خواجہ بو علی قلندر رحمۃ اللہ علیہ پانی پتی کا عہد سلطان علاء الدین خلجی کا عہد تھا۔ آپ حضرت امیر خسروؒ کے ہم عصر تھے۔ بڑے پائے کے بزرگ تھے اور صاحبِ کشف و کرامت تھے۔ پانی پت میں آپ کا مزار مرجعِ خاص و عام ہے۔ آپ فارسی اور ہندی یعنی اردو دونوں میں شعر موزوں فرماتے تھے۔ ایک دوہے میں فرماتے ہیں۔

سجن سکارے جائیں گے اور نین مریں گے روئے
بدھنا ایسی رین کر بھور کدھی نہ ہوئے

فارسی زبان میں اسی مضمون کو یوں ادا فرماتے ہیں۔

من شنیدم یار من فردا رود راہ شتاب
یا الٰہی تا قیامت بر نہ آید آفتاب

حضرت نظام الدین اولیاؒ

آپ کا مقام بزرگانِ دین اور صوفیانِ باکمال میں بہت بلند ہے۔ طریقت اور

شریعت دونوں پر کاربند تھے۔ زاہد شب زندہ دار تھے اور حضرت امیر خسروؒ کے پیر و مرشد تھے۔ حضرت امیر خسروؒ کو آپ سے والہانہ پیار تھا۔ جب آپ کا انتقال ہوا تو امیر خسروؒ آپ کے مرقد پر جا کر بیٹھ گئے۔ تھوڑے دنوں بعد آپ بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔

حضرت امیر خسروؒ

ہندوستان کی سرزمین کا یہ نابغۂ روزگار اور طوطیٔ شکر مقال ایٹہ کے ضلع پٹیالی میں پیدا ہوا۔ حضرت نظام الدین اولیاء کی مریدی نے بڑا فیض بخشا۔ عہد خاندانِ غلاماں کا تھا۔ آپ نے کئی بادشاہوں کے عروج و زوال کا زمانہ دیکھا۔ سات عدد بادشاہوں کی ملازمت میں رہے اور بنگال اور پنجاب میں جنگیں بھی لڑیں۔ امیر خسروؒ ایک باکمال ہستی تھے۔ ایسے باکمال لوگ قدرت بڑی دیر بعد پیدا کرتی ہے۔ آپ ایک عالم بھی تھے۔ سپاہی بھی تھے۔ ماہر موسیقی بھی تھے۔ درویش باصفا بھی تھے اور عاشق بھی تھے۔ شاعر ایسے تھے کہ ہر صنف میں کمال حاصل کیا۔ موسیقی میں ایسے ایسے کمال دکھائے۔ ایسی ایسی جدتیں پیدا کیں کہ آج بھی اُن کے بنائے ہوئے راگ موجود ہیں۔ فارسی زبان میں مثنویاں بھی لکھیں اور غزلیں بھی کہیں۔ ان کے چار دیوان موجود ہیں۔ اس زمانے کی ہندی یا اردو زبان میں بے شمار اشعار، دوسخنے، کہہ مکرنیاں اور راگوں کی استھائیاں لکھیں۔ بے شمار گیت، دوہے، پہیلیاں، انملیاں ان کے نام سے مشہور ہیں۔ ریختہ زبان میں کئی غزلیں اور قطعے کہے۔ انہیں بھاشا زبان سے پیار تھا اور اس زبان میں ان کا بے شمار کلام ہے۔ مثلاً۔

اے دلی والے بتانِ سادہ   پگ بستہ و چیرہ کج نہادہ
یک گل ہبل وہ دیگر درول   گل زگل و گل زگل آید بروں
صفتِ بیڑہ قبول کہ نزد ہمہ خلق   بہ ازاں نیست بنائے ہمہ ہندوستاں

تیلی پسرے کرمی ذاشد نیلے   از دست و زبان چرب ادوالیے
خالے بہ لبش دیدم و گفتم کہ تل است   گفتا کہ بہ و نیست و ریں تل تیلے

گجری تو کہ در حسن لطافت چو مہی   آں دیگ دہی بہ سر تو چتر سنبھی
از ہر دو لبت شہد و شکر می ریزد   ہر گاہ کہ گوئی کہ دہی لیہو دہی

زرگر پسرے چو ماہ پارا   کچھ گھڑے سنوارے پکارا
نقد دل من گرفت و بشکست   پھر کچھ نہ گھڑا نہ کچھ سنوارا

خوار شدم زار شدم لٹ گیا   در غم ہجر تو گھر لوٹتا ہے
یار نہیں دیکھتا ہے سولے من   بے گنہ ہم ساتھ عجب روٹھا ہے

روئے تو رونق شکنِ آفتاب   سرو بہ پیش قد تو بوٹا ہے
گاہ ز خسرو تو نہ گفتی بیٹھ   وہ چہ کند بھاگ میرا پھوٹا ہے

•

اب ایک شعر اس دور کی غزل کا ملاحظہ ہو۔

شبانِ ہجراں دراز چوں زلف و روزِ وصلت چو عمر کوتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری ریتاں

اس شعر میں پہلا مصرعہ فارسی زبان میں ہے جبکہ مصرعہ ثانی ہندی زبان میں ہے۔

ایک نمونہ پہیلی کا یوں ہے۔

پہیلی

بالا تھا جب سب کو بھایا   بڑا ہوا کچھ کام نہ آیا
خسرو کہہ دیا اس کا ناؤں   بوجھ نہیں تو چھوڑ دے گاؤں

یہ مثال امیر خسرو کی ایسی پہیلیوں کی ہے جس کے اندر پہیلی کی بوجھ رکھ دی گئی ہے لیکن ایک بار پڑھنے سے معلوم نہیں ہوتی۔ آپ نے بڑی ذہانت سے یہ پہیلیاں مرتب کی ہیں۔ اس پہیلی میں پہلا لفظ بالا ہے جسے ہم پنجابی میں بالنا یعنی جلانا کہتے ہیں۔ اور چراغ کے گل ہو جانے کو چراغ کا بڑھنا کہتے ہیں۔ اب پہلے شعر کے معنی یوں ہوں گے کہ جب ہم نے دیا جلایا تو وہ سب کے من بھایا۔ سب کی آنکھوں بھلا لگا۔ لیکن جب بڑا ہوا، یعنی بجھ گیا تو کسی کے کام نہ آیا۔ تیسرے مصرعے میں اس پہیلی کی بوجھ دیا کہہ کر رکھ دی ہے۔

حضرت مخدوم علاء الدین علی احمد صابر

آپ حضرت بابا فرید شکر گنج کے داماد تھے اور بھانجے بھی تھے۔ آپ کا مزار کلیر شریف (ہندوستان) میں ہے۔ سیر الاقطاب میں درج ہے کہ آپ شعر بھی کہتے تھے۔ یہ ذکر سنہ ۱۲۶۵ عیسوی کا ہے۔ حضرت علی احمد صابر فارسی میں احمد اور ہندی میں صابر تخلص کرتے تھے۔ کتاب مذکور میں آپ کے فارسی کلام کا نمونہ نہیں ہے۔ صرف ہندی زبان کا ایک شعر درج ہے ۔

اس طرح اس میں ڈوب اے صابر   کہ بحر ہو کے غیر ہو نہ رہے

حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ شعر اپنی تفہیم اردو کے اعتبار سے آج کے زمانے کا شعر معلوم ہوتا ہے۔

حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ (۱۳۸۰ء)

حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ کو منیری بھی کہا جاتا ہے۔ منیری وہ اپنے آپ کو اس لیے کہتے تھے کہ ان کا وطن ضلع بہار کا ایک گاؤں یا قصبہ منیر تھا۔ آپ پوربی اور ہندی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ آپ کے کچھ ٹوٹکے اور منتر بھی ہیں۔ جن کے پڑھنے سے کہا جاتا ہے کہ بیماری یا بلا دور ہو جاتی ہے۔ مثلاً

شرف حرف ماثل کہیں درد کچھو نہ بسائے   گرد چھوٹی دربار کی سو درد دور ہو جائے

ان کے منتروں پر مشتمل ایک الگ رسالہ ہے جس کا ذکر ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے اپنے ایک مضمون میں کیا ہے۔ لیکن وہ رسالہ آج نایاب ہے۔ کہتے ہیں کہ نظام حیدرآباد دکن کی ذاتی لائبریری میں اُس کا ایک قلمی نسخہ موجود تھا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اردو کی پہلی نثری تصنیف

کچھوچھا شریف ضلع اودھ میں ایک علاقہ ہے جہاں سید اشرف جہانگیر سمنانی کا مزار ہے۔ سید اشرف جہانگیر سمنانی ۱۲۸۹ عیسوی میں پیدا ہوئے اور ایک سو بیس برس کی عمر پائی۔ وفات ۱۴۰۹ عیسوی میں ہوئی۔ سارے کے سارے محققین تنقید اردو اس حقیقت پر متفق ہیں کہ شمالی ہندوستان میں اٹھارویں صدی عیسوی سے پہلے نثر کی تصنیف و تالیف کا کوئی اتا پتا نہ تھا۔ گویا شمالی ہندوستان میں اٹھارویں صدی تک کوئی نثری تصنیف یا تالیف نہیں لکھی گئی تھی۔ اس اعتبار سے یہ شرف حیدرآباد دکن کے علاقے کو ہی حاصل ہے کہ وہاں شمالی ہندوستان سے چار سو برس پہلے اردو کی تصنیفات کا آغاز ہو چکا تھا۔ سید اشرف جہانگیر سمنانی نے ۱۳۰۸ عیسوی میں اردو زبان میں ایک رسالہ اخلاق و تصوف پر تصنیف کیا۔ میر نذر علی درد کاکوری لکھتے ہیں — "سید اشرف جہانگیر نے اپنے سلسلے کے ایک بزرگ مولانا وجیہ الدین کے ارشادات کو اردو زبان میں جمع کیا۔ اس زبان کو

اس زمانے میں زبان ہندی کہتے تھے۔ میں نے اپنے ایک بزرگ کے پاس خود اس کتاب کو دیکھا ہے۔ یہ قلمی کتاب ۲۰۰ صفحات پر مشتمل تھی۔ اس کی عبارت کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو۔

> "اے طالب آسمان زمین سب خدا میں ہے ہوا سب خدا میں ہے جو تحقیق جان اگر تجھ میں کچھ سمجھ کا ذرہ ہے۔ تو صفات کے باہر بھید تر سب ذات ہی ذات ہے"

اردو نثر میں اس سے پیشتر کسی کتاب کا ثبوت نہیں ملتا۔ سید اشرف جہانگیر کے اس رسالہ اخلاق و تصوف کی دریافت سے یہ ثابت ہوگیا ہے کہ نثر کی ابتدا دکن میں ہوئی اور یہ کہنا صحیح نہیں کہ امیر خسرو نے نظم اور نثر کی بنیاد دلّی میں رکھی یعنی شمالی ہندوستان میں۔

دکن میں اردو کی ابتدا ۱۳۱۲ عیسوی

سلطنت دلّی کے بادشاہ علاء الدین خلجی کے غلام ملک کافور نے ۱۳۰۷ء میں دکن کے علاقے پر یلغاریں شروع کر دی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ اس علاقے میں اپنی فتوحات کا دائرہ وسیع سے وسیع تر کرتا چلا گیا تھا۔ یہاں تک کہ ۱۳۰۷ عیسوی میں یعنی چھ برس کے اندر اندر اس نے سارے کے سارے مہاراشٹر کے علاقے کو اپنی دلّی کی قلمرو میں شامل کر لیا تھا۔ اور یوں مسلمانوں کی حکومت دلّی سے چل کر جنوبی ہند کے آخری علاقے راس کماری تک پھیل گئی تھی۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ یہ مسلمانوں کی فوج جو دہلی سے نکل کر دکن میں گئی اپنے ساتھ اردو زبان بھی لے کر گئی۔ ان لوگوں اور دوسرے امرا اور اہل علم و فن کے دکن میں آباد ہو جانے سے دکن میں اردو کی داغ بیل پڑ گئی۔ ان ہی لوگوں نے اہل دکن کو اردو سکھائی۔ ان لوگوں کے عہد سے پہلے دکن میں اردو کا رواج بالکل نہیں تھا۔ اردو زبان شروع نہ ہوئی تھی: تاریخی واقعات کے تسلسل و تواتر سے یہ بات بھی پایۂ تکمیل تک پہنچ گئی ہے کہ اس وقت شمالی ہند میں اردو زبان کا آغاز ہو چکا تھا اور اس میں شاعری بھی شروع ہو چکی تھی۔

اردو کی ابتدا گجرات میں ۱۲۹۷ء

ملک کافور کے دکن فتح کرنے سے پہلے دلّی کے بادشاہ علاء الدین خلجی نے گجرات پر حملہ کر کے اسے فتح کر لیا تھا۔ خلجیوں کے بعد تغلقوں کا دور شروع ہو گیا۔ ان دونوں شاہی خاندانوں کے دورِ حکومت میں گجرات دہلی کا ایک صوبہ رہا۔ سلطان محمد تغلق کے زمانے میں یعنی ۱۳۴۴ عیسوی میں یہاں زبردست بغاوت کے شعلے بلند ہو گئے۔ اس آگ کے شعلے بجھائے نہ جا سکے اور گجرات میں علیحدگی اور خود مختاری کی تحریک جاری رہی۔ آخر فیروز تغلق کے انتقال کے بعد ظفر خان کو گجرات کا حاکم بنا کر روانہ کیا گیا یہ ۱۳۹۱ عیسوی کا زمانہ ہے۔ ظفر خان حاکم بن کر گجرات میں وارد ہوا لیکن کچھ دیر گزر جانے کے بعد وہ خود ہی گجرات کا خود مختار بادشاہ بن بیٹھا اور اپنی حکومت کی داغ بیل رکھی۔ اس کا خاندان گجرات پر دو سو سال تک حکومت کرتا رہا۔

گجرات میں ابتدا ہی سے اربابِ علم و فن کا دور دورہ رہا تھا یہ دیکھا گیا ہے کہ مسلمان بادشاہوں کے ساتھ ہر ملک میں علماء، اہل دانش و فن اور اولیا اللہ بھی وہاں جایا کرتے تھے اور یوں ہر عہد میں اسلامی شریعت، اسلامی حکومت کے ساتھ ساتھ علوم اسلامیہ بھی رواج پاتے رہے۔ گجرات میں بھی مسلمان ارباب علم و دانش کا جمگھٹا رہا۔ شیخ گنج العلم بھی علم حاصل کرنے کے لیے صوبہ گجرات (کاٹھیاواڑ) تشریف لائے تھے۔ گجرات میں مسلمانوں کی وجہ سے اردو کی ابتدا ہوئی اور اردو نے دن دوگنی رات چوگنی ترقی شروع کر دی۔

۱۴۰۰ عیسوی میں سید برہان الدین عبداللہ بن محمود نوجوانی میں ہی پٹن (گجرات) تشریف لائے۔ آپ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے پوتے تھے۔ اس کے بعد سلطان احمد شاہ گجرات نے احمد آباد کو نئی زندگی بخشی اور وہاں لوگوں کو آباد کرنا شروع کر دیا تو سید برہان الدین پٹن سے نقل مکانی کر کے احمد آباد تشریف لے گئے۔ آپ نے مستقل اسی جگہ قیام کیا۔ گجرات میں آپ قطب عالم کے لقب سے مشہور ہوئے۔ آپ کے بیٹے سید سراج الدین محمد بن عبداللہ کا لقب شاہ عالم مشہور ہوا۔ حضرت قطب عالم کے بارے میں یہ روایت بڑی مشہور ہے کہ ایک روز پچھلی رات کو اٹھ کر باہر نکلے تو کسی چیز سے ٹھوکر لگی۔ آپ نے فرمایا۔

"لوہ ہے یا کڑا یا پتھر یا کیا ہے؟"

قطب عالم کا انتقال ۱۴۷۵ عیسوی میں احمد آباد میں ہوا۔ شاہ بارک اللہ چشتی نے بشارت نبوی کی تعمیل میں قطب عالم کے فرزند اکبر سید سراج الدین محمد بن عبداللہ کو شاہ عالم کا لقب دیا اور قطب عالم نے بشارت، خواب اور لقب کا واقعہ سنایا تو فرمایا کہ

"چشتیوں نے پکائی اور اسے بخاریوں نے کھائی"

شاہ عالم ۱۴۷۵ میں اللہ کو پیارے ہوئے۔

شیخ وجیہ الدین گجراتی عالم درویش کامل کے چند مقولے بحر الحقائق میں لکھے ہیں۔ مثلاً (الف) اس سیں ہور کیا ہے۔ اس دنیا میں کہ دل خدا سوں مشغول ہووے (ب) عارف اسے کہوں جو خدا سوں بھر یا ہووے۔"

اردو کی قبولیت ۱۳۳۳ء

مشہور مسلمان سیاح ابن بطوطہ طنجہ افریقہ کا رہنے والا تھا۔ وہ سلطان محمد تغلق کے عہد میں ہندوستان آیا یعنی ۱۳۳۳ عیسوی میں۔ اس کی مادری زبان عربی تھی۔ اس نے اپنا مشہور سفرنامہ عربی زبان میں ہی لکھا۔ لیکن اس دور میں اردو کا رواج اس قدر عام ہو چکا تھا کہ اس نے اپنے سفرنامے میں بے شمار الفاظ فارسی کے لکھے۔ مثلاً پردہ۔ پروانہ۔ یارگہ۔ ناخدا وغیرہ۔ ان کے ساتھ ہی ساتھ اس نے ان گنت الفاظ اردو کے بھی لکھے مثلاً ڈولہ، کہار، ٹٹو، منڈی، کنگھر۔ ان الفاظ کے ہندی حروف کو اس نے عربی کے حروف میں تبدیل کر لیا تھا۔ کئی جگہوں پر اس نے الفاظ میں بھی تبدیلی کر لی تھی۔ مثلاً کچہری کو اس نے کشہری لکھا۔ چودھری کو جوتری، جوگی کو جوگیہ اور کٹارہ کو قطارہ لکھا۔

اس سفرنامے میں ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ دکن اور گجرات میں لوگوں کی عام بول چال کی زبان ایک ایسی زبان تھی جس میں عربی، فارسی، ہندی اور سنسکرت اور شمالی ہند کی بھاشاؤں کے لفظ پائے جاتے ہیں اور اس زبان کو یہاں کے لوگ زبان ہندی بولتے ہیں۔ ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ امرا کے گھروں اور دربار میں بھی یہی زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ فارسی اور عربی بھی لوگ جانتے ہیں اور ان دونوں زبانوں کے بڑے بڑے عالم یہاں پر موجود ہیں۔ لیکن جو قبولیت زبان ہندی کو میسّر ہے وہ کسی اور زبان کو نصیب نہیں ہے۔

دکن کے اولین نثر لکھنے والے (۱۴۰۹ء)

دکن اور صوبہ گجرات میں اردو نثر کی ابتدا کے ساتھ ہی وہاں پر نثریں، رسالے اور کتابیں لکھی جانے لگی تھیں یہ کتابیں زیادہ تر تصوف اور علم و حکمت اور بزرگانِ دین کے اقوال کی تدوین کے سلسلے میں تھیں۔

ملّا مذر محمد دہلوی المعروف بہ قاضی خان نے ۱۴۱۹ء میں فارسی زبان کی لغت لکھی جسے لغت اداۃ الفضلا کا نام دیا گیا۔

۱۴۴۹ء میں قوام الدین ابراہیم فاروقی نے بنگال میں سلطان رکن الدین باربک حاکم بنگالہ کے عہد میں ایک لغت فارسی ۱۴۷۵ء میں ترتیب دی اور اس کا نام انہوں نے شرف نامہ رکھا۔

۱۵۱۸ء میں شیخ لاد دہلوی نے سلطان ابراہیم لودھی کے زمانہ میں ایک فارسی زبان کی لغت کو تدوین کیا جس کا نام موید الفضلا رکھا۔

یہ تینوں سب سے پہلی لغات کی کتابیں ہیں جو ہندوستان کے اس علاقے میں معرضِ تحریر میں آئیں۔ یہ لغات فارسی الفاظ میں ہیں خاص طور پر لغت موید الفضلاء میں صدہا فارسی زبان کے الفاظ ہیں، جن کے مطالب اردو زبان میں لکھے گئے ہیں۔ اردو زبان کی مقبولیت اس دور میں کس قدر بڑھ گئی تھی اس کا اندازہ ان لغات کی ترتیب و تدوین سے لگایا جاسکتا ہے۔

کبیر داس (۱۴۴۰ء)

بنارس میں ایک جولاہے کو جھیل پر کنول کے پھول پر تیرتا ہوا ایک بچہ مل گیا۔ وہ خوشی خوشی اسے اٹھا کر گھر لے آیا۔ ان کے ہاں کوئی اولاد نہ تھی۔ انھوں نے اس بچے کا نام کبیر رکھ کر اس کی پرورش شروع کر دی۔ کبیر بڑے ہو کر خدا سے لو لگا چکے تھے۔ وہ دوہے اور کبت کہتے تھے جن میں خدا کی بھگتی کا ذکر ہوتا تھا اور علم و دانش کی باتیں ہوتی تھیں یہ عہد ہندوستان میں بھگتی کی لہر کا زمانہ تھا۔ بھگت کبیر نے رامانند کو اپنا گورو بنا لیا اور اپنا ایک الگ دین کبیر پنتھ بنایا۔ بعض تحقیقات کے مطابق کبیر پنتھ کا آغاز بھگت کبیر کے انتقال کے کافی دیر بعد ہوا۔ کبیر انسانی محبت میں سرشار تھے وہ کسی پنتھ کے قائل نہیں تھے۔ بہرحال یہاں اس سے بحث نہیں ہے۔ یہاں ان کے بارے میں لکھنا اس لیے مقصود ہے کہ کبیر اپنے دوہوں میں عربی اور فارسی کے الفاظ بے تکلف ادا کیا کرتے تھے۔ مثلاً

کبیر شریر سرائے ہے کیوں سوئے سکھ چین
کوچ نقارہ سانس کا باجت ہے دن رین

کانکر پاتھر جوڑ کے مسجد لیے چنائے
تا چڑھ ملا بانگ دے کیا بہرا ہوئے خدائے

دین گنوایو دنی سے دنی نہ آیو ہاتھ
پیر کہاڑی ماریو گا پھل اپنے ہاتھ (غافل)

بعض اصحاب کی رائے ہے کہ کبیر داس نے غزلیں بھی کہی ہیں جو اس دور کی زبان ہندی میں ہیں۔ لیکن ایک طبقے کا خیال ہے کہ کبیر نے صرف دوہے ہی کہے ہیں۔ کبیر داس کے نام منسوب غزلوں کی سند بھی مشکوک ہے۔ اگر یہ غزلیں کبیر داس کی ہیں تو پھر یہ کہنا بالکل غلط ہو جاتا ہے کہ غزل کی ابتدا دکن میں ہوئی۔ ایک غزل جو کبیر داس کے نام منسوب کی گئی ہے۔ اس کے چند اشعار یوں نقل کئے گئے ہیں ؎

ہمن ہے عشق مستانہ، ہمن کو ہوشیاری کیا
رہیں آزاد یہ جگ میں، ہمن دنیا سے یاری کیا
کبیرا عشق کا ماتا، دوئی کو دور کر دل سے
جو چلنا راہ نازک ہے ہمن کو بوجھ بھاری کیا

گورو نانک جی (۱۴۶۹ء)

گورو نانک دیو جی سکھ مذہب کے بانی تھے اور کبیر داس کے ہم عصر تھے۔ گورو نانک دیو جی بھگت کبیر کی تعلیمات اور شاعری سے بہت متاثر ہوئے۔ گورو نانک نے بھی دوہے اور شعر لکھے۔ جن میں فارسی اور عربی زبان کے الفاظ کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ حالانکہ ان کے دوہے ہندی زبان میں لکھے گئے ہیں۔ یہ بھی اردو زبان کی مقبولیت کا ایک زندہ ثبوت ہے۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو۔

سانس ماس سب جیو تمہارا تو ہے اکھرا پیارا
نانک شاعر یوں کہت ہے سچے پروردگارا

۱۵۲۶ء عیسوی میں پانی پت کے میدان میں بابر نے ابراہیم لودھی کو شکست دے دی تو ابراہیم لودھی کا سر کاٹ کر اس کے سامنے لایا گیا تو درباریوں میں سے کسی نے فی البدیہہ یہ اشعار پڑھے۔

نو سے اوپر تھا بتیسا پانی پت میں بھارت دلیا
اٹھیں رجب سکر وارا بابر جیتا براہیم ہارا

۸ رجب ۹۳۲ ہجری۔ جمعہ

مغل سلطنت کا قیام (۱۴۸۳ء)

بابر نے پانی پت کے میدان میں ابراہیم لودھی کو شکست دے کر ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کا سنگ بنیاد رکھا بابر مغل سلطنت کا پہلا بادشاہ تھا۔ اس نے ۱۵۱۵ء میں پہلی فتح مند یلغار سندھ پر کی اور تیسرا بڑا حملہ ۱۵۲۶ء عیسوی میں کرنے کے بعد دہلی پر قبضہ کر لیا۔ بابر ایک لائق اور شاعر بادشاہ تھا۔ وہ ایک بہادر سپاہی بھی تھا اور قادر الکلام نثر نگار اور شاعر بھی تھا۔ وہ ترکی اور فارسی زبان میں شعر کہتا تھا۔ اب اس کا دونوں زبانوں کا دیوان ایک جگہ چھپ کر دستیاب ہے۔ اس نے تزک بابری کے نام سے بزبان ترکی اپنی زندگی کے واقعات ایک جگہ مرتب کئے۔ ہندوستان میں اپنی سلطنت قائم کرنے کے بعد اس نے اردو زبان کے فروغ میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس کی اس دور کی نثر اور نظم میں بھی اردو زبان کے بے شمار الفاظ اور محاورے ملتے ہیں مثلاً۔ ہاتھی، پان، پنکھا، جامن، کمرک، کیوڑا، کھرونا، چرونجی، مور، گھری، دربیر وغیرہ۔ مزید برآں کہ اس کے ایک ترکی شعر میں بھی اردو کے الفاظ اور افعال ملتے ہیں۔ لکھتا ہے۔

مجکا نہ ہوا کچھ ہوس مانک و موتی فقرا ہلیغہ بس بولغوسیدر پانی و روتی

۱۵۳۵ء میں ہمایوں بادشاہ نے سریر آرائے سلطنت ہوتے ہی مالوہ اور گجرات کے حاکم بہادر شاہ پر چڑھائی کی۔ اس کا سپہ سالار اندر ہی اندر مغلوں سے ساز باز کیے ہوئے تھا۔ بلکہ تاریخ میں لکھا ہے کہ یہ سپہ سالار مغلوں کے ساتھ مل چکا تھا۔ اس سپہ سالار کی غداری اور بے وفائی سے بہادر شاہ کو زبردست شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ مغلوں نے بہادر شاہ کے محل کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ لوٹ مار کا بازار کئی روز تک گرم رہا۔ اس لوٹ مار کے دوران محل سے ایک طوطا بھی مغلوں کے ہاتھ آیا۔ یہ طوطا بزبان ہندی لوگوں سے باتیں کرتا تھا۔ اس طوطے کو ہمایوں بادشاہ

کے سامنے پیش کیا گیا۔ اتفاق کی بات ہے کہ وہاں اس وقت دربار میں بہادر شاہ کا غدار سپہ سالار رومی خان بھی موجود تھا۔ طوطے نے رومی خان کو دیکھتے ہی چلا کر کہا۔

" پھٹ پاپی رومی خان نمک حرام۔ پھٹ پاپی نمک حرام "

تلسی داس (۱۶۲۳ء)

تلسی داس کا زمانہ شہنشاہ اکبر کا زمانہ ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا گیا ہے۔ یہ بھگتی لہر کا عہد تھا۔ اکبر نے اس لہر کو زبردست ہوا دی تھی۔ کبیر، نانک اور تلسی داس اسی بھگتی کی تحریک کے ساتھ ابھرے تھے۔ تلسی داس نے ہندی زبان میں رامائن لکھی۔ یہ نظم بہت لمبی نظم ہے۔ مہابھارت میں ہندوؤں کے تقدس، ان کی دیومالا اور جنگوں کے حال لکھے ہیں۔ اس زمانے کی عام بول چال میں عربی اور فارسی کے الفاظ اس قدر مقبول تھے اور عام تھے کہ تلسی داس نے اپنی طویل نظم رامائن میں عربی فارسی کے الفاظ جگہ جگہ استعمال کئے ہیں۔ تلسی داس کے دوہے بھی بہت مشہور ہیں۔ ان دوہوں میں تو وہ بڑی بے تکلفی سے عربی اور فارسی کے لفظ استعمال کرتا چلا جاتا ہے۔ مثلاً

تلسی داس کے تم ہو گریب نواز
ہمرا پار اتارو جہت جاج (جہاز)

جو بینا ہیں نا کہے، بیٹھی شکر کھائے
جو بکری ہیں ہیکے ہے ہی ماری جائے
تلسی سیدھی چال سے پیادہ ہووے وزیر
فرزیں شاہ نہ ہو سکے ٹیڑھی تاثیر

سور داس

بھگت سور داس بھی اسی زمانے کا شاعر اور بھگت تھا۔ یہ ایک عجیب حقیقت ہے کہ ایک ہی عہد میں اتنے خدا پرست شاعر اور بھگت اس دور کے معاشرے میں زندہ تھے اور اپنے کلام سے لوگوں میں انسانی ہمدردی اور نیک خیالات کا بیج بکھیر رہے تھے۔ سور داس کے بارے میں عام روایت یہ ہے کہ وہ پہلے بھگت نہیں تھے بلکہ ایک امیر آدمی کے دنیا دار لڑکے تھے۔ پھر ایک جذباتی صدمے کے بعد وہ بھگت بن گئے۔ انہیں بھگوان کرشن سے بڑا پیار تھا۔ وہ آخری عمر میں آنکھوں کی بصارت سے محروم ہو گئے۔ ایک قصہ ان کے بارے میں یوں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ عام طور پر بصارت نہ ہونے کی وجہ سے اپنے ایک منیم سے دوہے اور شعر لکھوایا کرتے تھے۔ منیم ایک خاص وقت پر قلم دوات لے کر ان کے پاس بیٹھ جاتا تھا۔ سور داس طبع موزوں ہونے کے بعد فکر سخن کرتے اور جونہی ان کی زبان پر دوہا وارد ہوتا منیم اسے لکھتا چلا جاتا تھا۔

ایک روز ایسا اتفاق ہوا کہ منیم کو آنے میں دیر ہو گئی۔ جب فکر سخن کا وقت ہوا تو سور داس نہا دھو کر چوکے پر بیٹھ گئے اور منیم کا انتظار کرنے لگے۔ منیم ابھی نہیں آیا تھا کہ سور داس جی کی آمد نے زور پکڑا اور وہ بے اختیار شعر کہنے لگے۔ انہیں خیال تھا کہ منیم ابھی نہیں آیا۔ انہوں نے آواز دے کر تسلی کے لیے پوچھا۔ منیم جی! تم آ گئے؟" آواز آئی۔

" ہاں سور داس جی! میں آ گیا ہوں"

" تو پھر لکھتے جائیں "

سور داس شعر بولتا اور منیم جی لکھتے چلے جاتے۔ اچانک سور داس نے محسوس کیا کہ منیم آج کچھ کمال دکھا رہا ہے وہ یوں کہ ابھی سور داس کی زبان پر آدھا شعر ہوتا ہے اور وہ آگے سے دوسرا آدھا شعر بھی بول کر لکھ دیتا ہے جبکہ منیم کے ہاں ایسی علمی اور شعری استعداد بالکل نہیں تھی۔ ویسے بھی ایسا نہیں ہو سکتا تھا کہ آدھا بھجن ابھی سور داس کے ذہن میں ہو اور منیم اسے بول کر لکھ بھی دے۔

بجلی ایسی تیزی کے ساتھ سور داس جی کے دماغ میں ایک خیال آیا۔ انہوں نے منیم جی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ کہتے ہیں کہ وہ کرشن خود بیٹھے تھے اور سور داس کے منہ سے نکلے ہوئے بھجن لکھتے چلے جا رہے تھے۔ کرشن جی نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور بھاگ گئے۔ یہاں پر سور داس نے ایک دوہا کہا جس کا مطلب یہ ہے کہ۔

" اے کرشن جی! تم میری کلائی جھٹک کر آسانی سے مجھے چھوڑ کر جا سکتے ہو۔ لیکن میرے پردے سے نکل کر دکھاؤ تب تمہیں مانوں "

تلسی داس اور کبیر کی مانند سور داس کے کلام میں بھی ہمیں عربی اور فارسی کے الفاظ جگہ جگہ ملتے ہیں۔ مثلاً۔

کیست بہت کا ہے تم تانے، بین سی آواج (آواز)
دیو نہ جات پار اتر آوے، چاہت چڑھیں جہاج (جہاز)

کتاب "تاریخ ہمایونی" کے قلمی نسخے میں یہ واقعہ درج ہے کہ ایک بار شہنشاہ اکبر کے دربار میں کسی بات پر غصے میں آ کر ادہم خان نے خان اتکہ کو قتل کر ڈالا۔ تو اکبر نے بے ساختہ ادہم خان سے کہا۔

" اے ملچھ گاودی تو کیوں اتکہ مارا از جان بے جان کر دی "

اسی طرح اس کتاب میں ایک اور واقعہ درج ہے کہ جب اکبر نے جہانگیر کی شادی راجہ بھگوان داس کی لڑکی سے کی تو شہنشاہ اکبر اور جہانگیر دلہن کی پالکی خود اپنے کندھوں پر اٹھا کر چلے۔ اس وقت راجہ بھگوان داس نے کہا۔

ہماری بیٹی تمہارے محلوں کی چیری ہم باندہ گلام رہے
تو ٹھیک اس وقت شہنشاہ اکبر نے کہا
تمہاری بیٹی ہمارے محلوں کی رانی تم صاحب سوا رہے

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی تصنیف زاد المتقین میں لکھا ہے کہ ان کے استاد و مرشد حضرت شیخ عبدالوہاب متقی متوطن مالوہ دکن سے ہجرت کر کے مکہ معظمہ میں سکونت اختیار کر گئے تھے۔ آپ وہاں ۴۷ برس تک تشنگانِ علم و حکمت کو درس دیتے رہے۔ مکہ معظمہ ہی میں سنہ ۱۵۹۲ء میں وفات پائی۔ درس و تدریس کی صورت یہ تھی کہ عرب طلبہ کو عربی زبان میں سمجھاتے تھے۔ ایران میں رہنے والوں اور دوسرے علاقے کے باشندوں کو فارسی زبان میں سمجھاتے اور ہندوستان کے رہنے والوں کو اردو زبان میں درس دیتے تھے۔

ان تمام واقعات اور تاریخی شواہد سے ثابت ہوتا ہے کہ محمد تغلق کے زمانے ہی سے یعنی سنہ ۱۳۲۷ء میں ہی اردو زبان ایک مستقل شکل اختیار کر کے بول چال کی عام زبان بن چکی تھی۔ لین دین اور کاروبار اسی زبان میں ہوتا تھا اگرچہ اس وقت کی درباری، دفتری اور کتابی زبان فارسی تھی۔ لیکن رعایا اردو زبان میں ہی بول چال کرتی اور کاروبار کرتی تھی۔ بہتر ہوگا اگر اسی دور کی شمالی ہند کی شاعری پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے۔ اگر شمالی ہند میں کبیر داس، تلسی داس، گورو نانک دیو اور سور داس کے دوہوں میں فارسی اور عربی زبان کے الفاظ عام استعمال ہونے لگے تھے۔ ہندی شاعری میں بھی عربی فارسی کے الفاظ آ گئے تھے۔ اس کے علاوہ اردو شاعری کی بنیاد ان عربی فارسی آمیزہ ہندی دوہوں سے رکھی جا چکی تھی۔ لیکن اس کے باوجود ہم اسے اردو شاعری نہیں کہہ سکتے۔ یعنی ایسی شاعری نہیں کہہ سکتے جس کی بحریں فارسی

بحریں شامل ہوں۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ہمیں سب سے پہلے فارسی بحروں کا استعمال بھگت کبیر اور امیر خسروؒ کی غزلوں میں ملتا ہے۔ اگرچہ اس بارے میں ہم کوئی سند پیش نہیں کر سکتے جنہوں نے سند پیش بھی کی ہے ان کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس کے باوجود ہم انہیں نظر انداز نہیں کر سکتے اور اس حقیقت سے تو کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ تلسی داس اور بھگت سورداس کے زمانے میں ہی ایسے ہندی کے شاعر بھی تھے جو اردو فارسی کی ملی جلی غزلیں کہتے تھے اور اس کے بعد بھی اس قسم کی شاعری اور غزلیں کہنے کا سلسلہ آگے بڑھتا چلا گیا۔

مرزا عبدالقادر بیدل (۱۷۲۱ء)

مرزا عبدالقادر بیدل پٹنہ کے شہر عظیم آباد میں پیدا ہوئے۔ یہ وہی عظیم آباد ہے جس کے بارے میں داغؔ نے کہا تھا

کوئی چھینٹا پڑے تو داغؔ کلکتے چلے جائیں
عظیم آباد میں ہم منتظر ساون کے بیٹھے ہیں

بیدل کی پیدائش اگرچہ پٹنہ کے اس مردم خیز خطہ عظیم آباد میں ہوئی تھی لیکن ان کی پرورش دلی میں ہوئی۔ دلی کی گلیوں میں کھیل کود کر بڑھے ہوئے۔ یہ دور محمد اعظم بن شہنشاہ عالمگیر کا دور تھا۔ مرزا بیدل نے بڑی موزوں طبع پائی تھی۔ علم سے بچپن ہی سے لگاؤ تھا۔ شعر شروع ہی سے کہنے لگے تھے۔ شعر فارسی میں کہتے تھے اگرچہ دو شعر اردو کے بھی کہے ہیں جن کو قائم چاندپوری اور میر کے تذکروں میں لکھا گیا ہے۔

مت پوچھ دل کی باتیں وہ دل کہاں ہے ہم ہیں
اس تخمِ بے نشاں کا حاصل کہاں ہے ہم ہیں
جب دل کے آستاں پر دل آن کر پکارا
پردے سے یار بولا بیدل کہاں ہے ہم ہیں

بیدل کی اردو زبان کی شستگی اور صفائی دیکھ کر حیرت ہوتی ہے حالانکہ اس وقت تک دلی میں ولی دکنی کی شاعری کا اثر عام تھا۔ بیدل کی فارسی شاعری نے اس کے بعد کی اردو شاعری کو بہت متاثر کیا۔

نوری اعظم پوری (۱۵۵۶ء)

نوری کا ایک شعر میر حسن نے اپنے تذکرہ شعرا میں درج کیا ہے۔

ہر کس کہ خیانت کند البتہ بترسد
بیچارہ نوری نہ کرے ہے نہ ڈرے ہے

نوری اعظم پور میں پیدا ہوئے اور اسی جگہ پروان چڑھے اور درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ نوری سے فیضی کے بھی بڑے دوستانہ مراسم تھے چنانچہ ایک کتاب میں جو کہ دکن میں چھپی تھی لکھا ہے کہ آخری عمر میں جا کر ان دونوں دوستوں میں کچھ ان بن سی ہو گئی تھی لیکن پھر صلح ہو گئی اور آخر دم تک دوست رہے۔ یہ زمانہ شہنشاہ اکبر کا زمانہ تھا۔ نوری اعظم پوری غزلیں اور مثنوی بھی کہتے تھے۔ ان کی مثنویاں نہیں ملتیں لیکن غزل کا ایک دیوان چھپا جو بعد میں ناپید ہو گیا۔ اس کی کچھ غزلیں حیدرآباد دکن میں ایک صاحب کے پاس موجود تھیں۔ ڈاکٹر اعظم کریوی نے اپنے ایک مقالے میں لکھا ہے کہ یہ صاحب ان کی غزلیں لے کر ہندوستان سے باہر چلے گئے اور پھر ان کا کوئی پتا نہ ملا۔

حضرت کمال الدین مخدوم شیخ (۱۵۹۳ء)

آپ شیخ سعدی کاکوروی کے نام سے بھی مشہور ہیں۔ آپ کا زمانہ بھی اکبر بادشاہ ہی کا زمانہ ہے اور اسی عہد میں کاکوری میں پیدا ہوئے۔ اور وہیں وفات پائی۔ آپ ہندی زبان میں غزل کہتے تھے۔ ان کی ایک غزل کا مشہور شعر ہے۔

؎ ہمنا تمن کو دل دیا تم دل لیا اور دکھ دیا
ہم یہ کیا تم وہ کیا ایسی بھلی یہ پیت ہے

پنڈت چندر بھان (۱۶۶۲ء)

پنڈت چندر بھان برہمن تخلص کرتے تھے۔ یہ اکبر آباد میں پیدا ہوئے عربی زبان کے عالم تھے۔ یہی وجہ ہے کہ شہنشاہ شاہجہان کے دربار میں منشی رہے۔ بعد میں داراشکوہ کے بھی ساتھ میر منشی کی حیثیت سے کچھ عمر بسر کی۔ آپ کی پیدائش تو آگرہ یعنی اکبر آباد میں ہوئی لیکن انہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ دلی میں بسر کیا۔ ان کا انتقال ۱۶۶۲ء میں ہوا۔ ایک شعر ملاحظہ ہو۔

؎ خدا نے کس شہر اندر ہمن کو لائے ڈالا ہے
نہ دلبر ہے نہ ساقی ہے نہ شیشہ ہے نہ پیالا ہے

یہ بات خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ پنڈت چندر بھان کی وفات کے بعد ولی اورنگ آبادی اس دنیا میں آئے سال . . . ، اس عیسوی میں دکن سے نقل مکانی کر کے دلی آئے۔ ولی اورنگ آبادی کے کلام کو مقبولیت عام اس وقت نصیب نہ ہو سکی۔ ۱۷۲۰ء میں ولی کا ایک دیوان دکن سے چھپ کر دلی میں آیا اور وہاں انہیں شہرت نصیب ہوئی۔

محمد افضل (۱۶۲۵ء)

مرزا محمد افضل میرٹھ کے ضلع جھنجھانہ میں پیدا ہوا۔ یہ بڑی خوبیوں کا شاعر تھا۔ تلسی داس ہی کے زمانے میں تھا۔ اپنا بچپن اور جوانی میرٹھ ہی کے گرد و نواح میں بسر کی۔ ان کے اشعار میں محبت کے مضامین جگہ جگہ ملتے ہیں۔ خوش شکل ہونے کی وجہ سے عشق کے میدان میں بار آوری نصیب ہوتی تھی۔ ایک عورت پر فریفتہ ہو کر اپنی داستانِ محبت بڑے خوبصورت اور پُر درد انداز میں مثنوی کے انداز میں بیان کی یہ مثنوی کافی لمبی ہے۔ موسموں کے بارے میں بھی بے شمار نظمیں کہیں۔ کچھ نظمیں ہندوستان کے اس وقت کے عورتوں کے رسم و رواج کے بارے میں بھی کہی تھیں جو آج نہیں مل رہی ہیں۔ مرزا محمد افضل ۱۶۲۵ میں راہی ملک عدم ہوئے۔

معزالدین موسوی خان فطرت (۱۶۹۰ء)

عالمگیر کے دربار میں اس زمانے کے رواج کے مطابق عرب و عجم سے بڑے بڑے کمال کے بزرگ موجود تھے۔ بڑے بڑے مقتدر اہلِ فن اور اہلِ علم و دانش ہندوستان میں آ کر دربار میں حاضر ہوتے اور اپنے فن کی بدولت قبولیت دربار حاصل کی اور بادشاہ نے ان پر انعام و اکرام کی بارش کی۔ معزالدین موسوی خان فطرت بھی ایران کے مشہور شہر مشہد سے تشریف لائے تھے بادشاہ عالمگیر کے دربار میں انہیں بڑی عزت ملی اور بادشاہ نے انہیں خاص اعزاز سے نوازا۔ فطرت بنیادی طور پر فارسی کے شاعر تھے اور فارسی ہی میں شعر کہتے تھے لیکن چونکہ اس زمانے میں ہندوستان میں بزبان ہندی شعر کہنے کا بڑا رواج تھا اس لیے کبھی کبھی ہندی زبان میں بھی شعر کہتے تھے۔ ایک شعر مثال کے طور پر ان کا پیش کیا جا رہا ہے جس میں انہوں نے اردو اور فارسی، دونوں زبانوں کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ شعر ہے۔

اززلف سیاہ تو بدل دھوم پڑی ہے
در گلشنِ آئینہ گھٹا جھوم پڑی ہے

ایک اور بات اس شعر سے پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ اس زمانے کی دہلی میں اس قسم کی مخلوط شاعری کا بڑا چرچا تھا جبکہ ولی اورنگ آبادی کی شاعری ابھی دہلی کی فضاؤں میں نہیں پہنچی تھی۔

جعفر زٹلی (۱۶۵۹ء)

جعفر زٹلی تاریخ اردو شعر میں ایک مزاحیہ شاعر کی حیثیت سے مشہور ہے۔ تذکرہ نگاروں نے اسے مسخرہ شاعر کہا ہے جس کے بارے میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے اپنے ایک تنقیدی مقالے میں اختلاف کرتے ہوئے کہا ہے کہ جعفر زٹلی ایک بذلہ گو اور پُرمغز شاعر تھا۔ اس نے ہندی زبان میں غزلیں بھی کہیں ہیں۔ جن کو ان کے مزاحیہ کلام کی وجہ سے زیادہ اہمیت نہیں دی گئی اور یہ ان کے ساتھ تاریخ کی بہت بڑی زیادتی ہے۔ جعفر زٹلی بادشاہ عالمگیر کے زمانے میں دلی میں پیدا ہوا اور ۱۷۱۳ء میں وفات پائی۔ جعفر زٹلی ایک نغز گو شاعر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اسے عالمگیر بادشاہ کے شہزادوں محمد سلطان، محمد معظم اور محمد اعظم کے درباروں میں بھی باریابی نصیب تھی۔ اپنی شعری استعداد کی وجہ سے جعفر زٹلی اپنے ہم عصر شعرا میں ایک ممتاز درجہ رکھتا تھا۔ یوں تو اس نے ہزلیات ہی لکھی ہیں لیکن ان کی ہزلیات میں بھی جگہ جگہ ادبی رنگ ملتا ہے اس ادبی رنگ میں ظرافت کی چاشنی بڑی شائستگی اور تہذیب کے ساتھ آتی ہے اُس کے نام ایک مجموعۂ کلام بھی منسوب ہے جس کا نام کسی تذکرہ نگار کو معلوم نہ تھا۔ ویسے جعفر کی بے شمار ہزلیات اور دوسرا کلام سینہ بسینہ لوگوں تک چلا آتا رہا ہے۔ جعفر زٹلی عمر میں ولی اورنگ آبادی سے عمر میں کافی بڑا تھا اس کا ثبوت ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے ایک مقالے میں ملتا ہے جہاں انہوں نے لکھا ہے کہ جس وقت ولی اورنگ آبادی دہلی آیا تو اس وقت جعفر زٹلی کی عمر چالیس برس کے قریب تھی۔ اس اعتبار سے یہ بات بھی تصدیق شدہ ہے کہ جعفر زٹلی نے ولی اورنگ آبادی کے دلی آنے سے پہلے شاعری کی ابتدا کی تھی اور وہ غزلیں اور ہزلیات لکھتا تھا۔ ڈاکٹر اعظم کریوی نے اپنے ایک مقالے میں یوں تو جعفر زٹلی کی بہت سی ہزلیات لکھی ہیں لیکن ایک طویل نظم میں اس نے عالمگیر کے دو شہزادوں، یعنی شہزادہ محمد اعظم اور شہزادہ محمد معظم کی آپس کی لڑائیوں کا حال بیان کیا ہے۔ اس نظم میں جعفر زٹلی نے اس خانہ جنگی سے پریشان ہو کر شہنشاہ عالمگیر کے پُرسکون زمانے کو یاد کیا ہے اور دونوں شہزادوں کی بچوں ایسی لڑائیوں کا مذاق بھی اڑایا ہے۔

ڈاکٹر اعظم کریوی کے انتخاب کی ایک جھلک ملاحظہ ہو۔

کہاں اب پایئے ایسا شہنشاہ　　کمال اکمل و کامل دل آگاہ
الست کے انجواں دل رو رہا ہے　　نہ میٹھی نیند کوئی سو رہا ہے
دوادو ہر طرف جھگڑ پڑی ہے　　کچھ درگور سر گٹھیا دھری ہے
اذاں سو اعظم وذیں معظم　　ذیہہ کے واسطے لڑتے ہیں باہم
میاں جعفر زباں کو مختصر کر　　ز دورِ مخلف دل میں حذر کر

اس کے ساتھ ہی ساتھ جعفر زٹلی نے اس دور کی سیاسی شورشوں اور خانہ جنگیوں سے متاثر ہو کر ایسی نظمیں بھی کہیں جن میں اس دور کی ساری کشمکش اور خانہ جنگیوں اور بے اطمینانی کی بھرپور جھلک دکھائی دیتی ہے۔ اس نظم کو جعفر نے شہر آشوب کے نام سے لکھا۔ اس شہر آشوب کے چند شعر بھی ہم نے ڈاکٹر اعظم کریوی کے تذکرے میں سے لیے ہیں۔ یہ تذکرہ الہ آباد پبلشنگ ہاؤس نے چھاپا تھا۔ ملاحظہ ہو۔

گیا اخلاص عالم سے عجب یہ دور آیا ہے
ڈرے سب خلق ظالم سے عجب یہ دور آیا ہے
کہ بھیے راستی کوئی، عمر سب جھوٹ میں کھوئی
اتاری شرم کی لوئی عجب یہ دور آیا ہے
نہ یاروں میں رہی یاری نہ بھائیوں میں وفاداری
محبت اٹھ گئی ساری عجب یہ دور آیا ہے
خوشامد سب کریں زر کی چو بیگانہ چہ زن گھر کی
بھلا دی بات سب ہر کی عجب یہ دور آیا ہے

جعفر زٹلی ہی کے ہم عصر ایک شاعر سید عبدالجلیل اثلی ہیں۔ یہ صاحب نارنول سے نقل مکانی کر کے دلی گئے اور کچھ عرصے بعد دوبارہ نارنول آ کر پھر سے آباد ہو گئے یہ صاحب جعفر زٹلی کے دوست بھی تھے۔ ان کی اس زمانے کی ایک غزل کے چند اشعار نمونے کے طور پر پیش خدمت ہیں۔

رخسار پُر بہار سمن رونق چمن
یا گل گلاب کا کہوں یا لالہ یاسمن
یا حقۂ جواہر و یا درج در کہوں
یا غنچۂ گلاب کہوں یا کہوں دہن
یا قدِ خوش خرام چلے جب چٹک لٹک
شمشاد اور صنوبر خم کھا دیں در چمن
گیسوئے تابدار ہیں یا ناگ ہے بھونگ
یا زلفِ مشک تاب ہے یا نافۂ ختن
برتوسنِ کرشمہ سوار است نازنین
بیتد اثلی زیادہ دیدار اور کمن

قبول کشمیری (۱۷۲۶ء)

ان کا اصل نام مرزا عبدالغنی تھا۔ کشمیری نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے دادا سری نگر سے ہجرت کر کے دہلی چلے آئے تھے۔ اور کپڑے کا کاروبار کرتے تھے۔ فارسی زبان اور عربی زبان اپنے والد صاحب سے سیکھی۔ شاعری ورثے میں ملی تھی۔ ان کے دادا بھی فارسی میں شعر کہتے تھے۔ ایک دیوان فارسی کلام کا چھپا بھی تھا جو امتدادِ زمانہ کے ہاتھوں ناپید ہو گیا۔ قبول کشمیری بھی زیادہ تر فارسی زبان میں ہی شعر کہتے تھے لیکن ہندی زبان میں بھی شعر کہتے تھے یعنی زبان اس وقت کی اردو زبان تھی۔ ان کا ایک شعر یوں ہے۔

دل یوں خیالِ زلف میں پھرتا ہے نعرہ زن
تاریک شب میں جیسے کوئی پاسباں پھرے

یہ شعر بڑی شستہ اور صاف اردو میں ہے۔

مرزا قزلباش امید (۱۷۴۶ء)

ان کا پورا نام مرزا محمد رضا قزلباش خان ہمدانی تھا اور تخلص امید کرتے تھے۔

آپ ہمدان سے جب ہندوستان آئے تو اس وقت شہنشاہ عالمگیر کا دور تھا۔ قزلباش کا خطاب انہیں شاہ عالم بادشاہ کے دربار سے ملا۔ ملازمت انہوں نے کرناٹک ضلع کے شہر بسان پور میں سید حسین علی بادشاہ گر کے دربار میں کی۔ باقی ساری

عمر دہلی میں گزری۔ برہان پور میں ملازمت ختم کرنے کے بعد دہلی چلے آئے تھے۔ اسی شہر نگار میں وفات پائی۔ اپنے ابتدائی قیام کے دوران امید کی شاعری پر فارسی غالب تھی۔ پھر دکنیت بھی اپنا اثر دکھانے لگی کہتے ہیں۔

باجن کی بیٹی آج میری آنکھ سوں پڑی
غصہ کیا دگالی دیا ذ دگر لڑی

ایک غزل کے دو شعر ملاحظہ ہوں جن میں فارسی اور صاف اردو کا رنگ زوروں پر ہے۔

در و دیوار سے اب صحبت ہے
یار بن گھر میں عجب صحبت ہے
تیری آنکھوں کو دیکھ ڈرتا ہوں
الحفیظ الحفیظ کہتا ہوں

اردو نثر کا پہلا عہد

گیارھویں صدی عیسوی کے شروع تک ہمیں دلی اور علاوہ بریں پورے شمالی ہند میں کسی مستقل اور تکمیل پذیر چھپی ہوئی یا غیر مطبوعہ اردو نثر کا سراغ نہیں ملتا۔ اس دور میں ہمیں صرف دو کتابیں نظر آتی ہیں۔ یہ دونوں کتابیں سید اشرف جہانگیر سمنانی کی لکھی ہوئی ہیں۔ ان میں سید اشرف جہانگیر کا رسالہ نثر زیادہ مقبول اور مستند ہے۔ دوسری نظم کی کتاب ہے جو کہ محمد افضل جھنجھانوی کی مثنوی ہے جس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔ اردو نے شمالی ہند کی گود میں پرورش پائی۔ اسے دکن نے بھی دودھ پلایا۔ لیکن جتنی آبیاری اردو شعر اور نثر کی شمالی ہند میں ہوتی اتنی اور کہیں نہ ہوئی۔ اس کے باوجود ہم اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ دکن کی وادی نے اردو نثر اور نظم کی اس وقت خدمت کی جبکہ شمالی ہند کا سارے کا سارا علاقہ خانہ جنگیوں، باہر کے حملوں اور سیاسی ریشہ دوانیوں سے دورِ آشوب بنا ہوا تھا۔ اگر ہم بہ نظرِ عمیق دیکھیں تو شمالی ہند کو اردو کی خدمت ترقی اور ترویج میں امتیاز ضرور حاصل ہے۔ مگر اس کی اصل خدمت اور تخم ریزی بندھیاچل کے میدانوں کی وادی زرخیز میں ہوئی۔ اس کا ثبوت ہمیں یوں ملتا ہے۔ کہ دکن میں چودھویں صدی عیسوی سے لے کر اٹھارھویں صدی عیسوی تک نظم اور نثر کی بے شمار کتابیں لکھی گئیں۔ زیورِ طبع سے آراستہ ہوئیں اور انہیں قبولِ عام حاصل ہوا۔ اور سند قرار پائیں۔

اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ شمالی ہند میں فاتحین جو باہر سے آئے ان کی زبان زیادہ تر فارسی تھی ترکی النسل فاتحین نے بھی شمالی ہند میں آکر فارسی ہی کو سرکاری زبان بنایا۔ شمالی ہند میں جتنی بھی سلطنتیں قائم ہوئیں وہاں فارسی ہی کو درباری زبان کا مرتبہ حاصل رہا۔ دربار میں فارسی زبان بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ بادشاہ خود فارسی زبان میں اپنے وزیروں اور شہزادوں سے خطاب کرتا تھا۔ عدالتوں میں سارا کام فارسی زبان میں ہوتا تھا دفتروں میں یہی زبان لکھی جاتی تھی۔ ہاں اس کے ساتھ ہی ساتھ آپس کے میل جول سے ایک نئی زبان بھی جنم لے رہی تھی جس کا نام اردو کی ابتدائی شکل ہی کہا جا سکتا ہے۔ ہندوستان کے لوگوں اور باہر سے آئے ہوئے ایرانی اور ترکی لوگوں کے میل ملاپ سے جو عام بول چال میں زبان جنم لے رہی تھی وہ ہندی تھی جو کہ اردو کی ماں تھی۔ لیکن اردو کو بادشاہوں کی سرپرستی نصیب نہ ہوئی تھی کیونکہ سرکاری درباری زبان ابھی تک فارسی ہی تھی۔ اردو کے ساتھ شمالی ہند کی یہ بہت بڑی بے اعتنائی تھی۔ اس کے باوجود اردو میں اتنی طاقت تھی۔ اتنا جوشِ نمو تھا کہ وہ عام لوگوں کے میل جول اور محبت سے سرسبز و شاداب ہوتی چلی جا رہی تھی۔

اس عہد میں جب کہ سرکاری درباری زبان فارسی تھی۔ ہر شاعر بادشاہ اور امراء کو خوش کرنے کے لیے اسی زبان میں شعر لکھتا جو کہ امراء کی اور بادشاہ کی زبان تھی۔ یعنی فارسی۔ اس زمانے میں نثر اور نظم میں جس قدر بھی لکھا جا سکا وہ سارے کا سارا فارسی زبان میں تھا۔ مسلمانوں نے ہندی کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ اس زمانے کے ہندو شعرا اور نثار بھی شاہی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے شاہ پسند زبان یعنی فارسی ہی میں شعر کہتے تھے۔ اپنے بچوں کو فارسی ہی پڑھاتے تھے اور فارسی زبان میں ہی گفتگو کرتے تھے۔ اگرچہ ان کے گھروں میں اس زمانے کی اردو زبان ہی بولی جاتی تھی۔ اس اعتبار سے اردو زبان ان کے گھروں میں جاگزیں ہو چکی تھی۔

بندھیاچل کی وادی، جنوبی ہند یعنی دکن میں یہ کیفیت نہ تھی۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ دکن شمالی ہند سے کافی دور واقع تھا۔ اس لیے مرکز کی خانہ جنگیوں، شورشوں، بغاوتوں اور سیاسی انقلابوں سے بچا ہوا تھا۔ علاء الدین خلجی کی فتح دکن کے بعد بہمنیہ سلطنت کے قیام تک یہاں شمالی ہند کی نسبت کافی امن اور سکون رہا تھا۔ دوسرے اس علاقے کی اپنی بولیوں کا رنگ گہرا تھا۔ اس سکون اور تیز اثر کی وجہ سے یہاں فارسی اور عربی کو وہ مقام حاصل نہ ہو سکا جو اس نے شمالی ہند میں پیدا کر لیا تھا۔ چنانچہ اس کے نتیجے میں ہند کی بھاشا نے تیزی سے آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ اور پھر جب حسن بہمنی نے چودھویں صدی عیسوی کے وسط میں محمد تغلق کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر کے دکن میں اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا اور بہمنی حکومت کو قائم کیا تو سرزمین دکن پر امن اور سلامتی ایک طویل دور کا آغاز ہوا۔ یہ بغاوت بڑی کامیاب تھی۔ اس کے بعد بہمنیہ سلطنت دکن میں دو سو برس تک قائم رہا یہ بڑا ہی بار آور اور نتیجہ خیز دور تھا۔ حسن بہمنی نے اردو کی ترقی و ترویج کے لیے جو سب سے بڑا اقدام کیا۔ وہ یہ تھا کہ تخت سنبھالتے ہی اس نے سرکاری زبان کو فارسی سے بدل کر ہندی کر دیا۔ ہندی زبان اس وقت اپنے ابتدائی ارتقائی دور میں تھی۔ دکن کی شاہی سرپرستی کے بعد اس نے بڑی تیزی کے ساتھ ترقی کے مراحل طے کرنے شروع کر دیے۔ حسن بہمنی نے ہندی زبان میں شعر کہنے والوں کو بڑے بڑے خطابوں سے نوازا۔ اہلِ علم و دانش کو انعام و اکرام دیے۔ انہیں بڑے بڑے عہدے عطا کیے۔ حسن بہمنی کے بعد بھی بہمنیہ سلطنت کے دوسرے بادشاہوں نے بھی اردو نوازی کا یہ سلسلہ جاری رکھا اور اردو دان طبقے پر انعام و اکرام کی بارشیں ہوتی رہیں۔ یہ ایک بہت انقلابی اور تعمیری قدم تھا جو دکن کے شاہی خاندان نے اردو کی تکمیل کے سلسلے میں اٹھایا۔ اس سے اردو کو نئی زندگی مل گئی اور اردو زبان میں کلاسیکل ادب تخلیق ہونا شروع ہو گیا۔

دکن میں اردو کی پہلی کتاب (۱۳۲۸ء)

چودھویں صدی عیسوی کی ابتدا اردو کے حق میں بڑی نیک فال ثابت ہوئی یہی وہ زمانہ تھا جب دکن میں سلطنت بہمنیہ کو استحکام ملا اور اس کے ساتھ ساتھ اردو زبان کے شعر و ادب کا بھی سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ اسی زمانے میں دہلی میں خلجی خاندان تغلق خاندان میں تبدیل ہو گیا۔ ۱۳۲۵ء میں محمد تغلق دہلی کے تخت پر متمکن ہوا اور اس نے دکن پر حملہ کر کے اسے قبضے میں کر لیا۔

دار الحکومت کو دہلی سے دولت آباد منتقل کر دیا چھبیس برس تک وہ دکن پر حکومت کرتا رہا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب امرائے سلطنت دہلی سے اٹھ کر دیوگیر یعنی دولت آباد چلے آئے تھے۔ اس کثیر التعداد ہجرت میں دہلی کے اہل عرفاء ماہرین علم و فن اور دانشور بھی دلی سے دکن منتقل ہو گئے۔ دکن میں اردو کے پہلے نثر کے مصنف شیخ گنج العلم بھی گجرات کاٹھیاواڑ سے نکل کر دکن آ گئے۔ پائے تخت دلی کے اٹھ جانے کے بعد وہاں کی رونقیں بھی چلی گئی تھیں۔ بادشاہ اہل فن کی سرپرستی کرتے تھے انہیں وظائف اور اکرام و انعام سے نوازتے تھے۔ چنانچہ دور دور سے اہل علم دولت آباد کھچے چلے آ رہے تھے۔ اسی لہر میں شیخ گنج العلم کا بھی دولت آباد میں ورود ہوا۔ آپ سب سے پہلے تو دولت آباد میں آ کر قیام پذیر ہوئے۔ اس کے بعد انہوں نے بیجاپور کا رخ کیا۔ یہاں مستقل طور پہ آباد ہو گئے۔ یہاں تک کہ ۱۳۹۲ء میں اسی جگہ وفات پائی۔ آپ ایک بلند پایہ بزرگ تھے۔ آپ نے مسائل شرعیہ کے بارے میں کئی ایک رسائل تصنیف کئے۔ دکن میں اردو کی یہ سب سے پہلی تصنیف ہونے والی کتابیں ہیں۔ افسوس کہ یہ کتابیں اب دستیاب نہیں ہیں بلکہ ناپید ہیں پاکستان کے قیام سے پہلے سنا تھا کہ ان رسائل میں سے چند ایک کے قلمی نسخے حیدر آباد دکن کی شاہی لائبریری میں محفوظ ہیں۔ خدا جانے ان کا وہاں کیا حشر ہوا ہو گا۔

معراج العاشقین

دکن میں ہی ۱۴۱۲ء اور ۱۴۲۲ء سن عیسوی کے درمیان اردو کی سب سے پہلی کتاب زیور طبع سے آراستہ ہوئی۔ اس کتاب کا نام "معراج العاشقین" تھا اور اس کے مصنف حضرت خواجہ بندہ نواز سید محمد گیسو دراز تھے۔ آپ کی شخصیت کے بارے میں پہلے بھی تحریر کیا جا چکا ہے کہ آپ دہلی میں ۱۳۲۰ء میں پیدا ہوئے۔ اسی شہر میں پرورش پائی۔ بچپن ہی سے طبیعت تصوف اور علم و حکمت کی طرف مائل تھی۔ بڑے ہو کر دہلی میں ہی خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی کو اپنا مرشد کامل بنا کر ان سے فیض پایا۔ چراغ دہلی نے خواجہ بندہ نواز کو مسند خلافت سونپا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دکن پر بہمنیہ حکومت قائم ہو چکی تھی اور فیروز شاہ بہمنی سریر آرائے سلطنت تھا یہ ۱۴۱۲ء کا دور تھا۔ خواجہ گیسو دراز فیروز شاہ بہمنی کے عہد حکومت میں دکن میں آ گئے اور گلبرگہ میں آ کر قیام کیا۔ یہاں آ کر آپ نے اپنا سلسلہ درس و تدریس شروع کر دیا۔ آپ دکنی اردو میں ہی درس دیا کرتے تھے۔ اسی زبان میں بات چیت کرتے تھے۔ اور اسی زبان میں آپ نے مختلف رسائل لکھے اور انہیں نقل کروا کر اپنے مریدوں میں تقسیم کیا۔ اسی زمانے میں آپ نے کتاب معراج العاشقین لکھی۔ ایک عرصے سے یہ کتاب ناپید تھی۔ اب زیور طبع سے آراستہ ہو کر سامنے آئی ہے۔ آپ نے مقولوں اور اشعاروں کو مدون کر کے چھوٹے چھوٹے کتابچوں کی صورت میں شائع کیا۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

گھوڑے کن بھتیر گھوڑ ہے اس کوں نہ حکمت ہوئے ہے
ہر دم ذکر سوں توڑے ہے غافل نہ ہو ہوشیار توں
کر وسلا دل گیان کا انعام دے خوش دھیان کا
چار اکھلا ایمان کا رکھ باندھ اپنے وار توں
خوگر شریعت نعل بند زین ہے طریقت زیر بند
حق ہے حقیقت پیش بند لگو معرفت اختیار توں
تب زید گھوڑا آئے گا مجھ لامکاں سے جائے گا
تب عشق جھگڑا پائے گا خود مارلے ترمار توں
شہباز حسینی کھوئے کر ہر دو جہاں ولی دھوئے کر
اللہ اپنے یک ہوئے کر تب پاوے گا دیدار توں

مقولہ :

"بھو کوں موئے سوں کچھ اپڑتا ہے۔ خدکوں اپڑنے کی استعداد ہو رہے۔"

؎ او معشوق بے مثال نبیؐ پایا اور نور نبی رسولؐ کا میری جیو میں بھایا
انہیں اپیں دیکھا نے کیسی آرسی لایا

معراج العاشقین کو انجمن ترقی اردو نے شائع کیا ہے یہ کتاب دکنی اردو میں لکھی گئی تھی۔ خواجہ گیسو دراز نے اس کے علاوہ بھی کئی رسالے اور کتابیں دکنی اردو میں لکھیں۔ معراج العاشقین کی عبارت ملاحظہ ہو۔

"اے عزیز! اللہ بندہ تیا ہیاں پہچان کو جانا۔ فیں تو شرع جانتا ہے۔ اول اپنی پہچانت بعد از خدا کی پہچانت کرنا۔"

ایک اور نمونہ عبارت کا حسب ذیل ہے۔

"انسان کے پوچھنے کو پانچ تن۔ ہر ایک تن کو پانچ دروازے ہیں۔ ہو پانچ دربان ہیں۔ پہلا تن واجب الوجود اسام اس کا شیطانی نفس اس کا امارہ دینی واجب الوجود کی آنکھ سوں غیر نہ دیکھنا سو۔ حرمد کے کان سوں غیر نہ سننا سو۔ حدمک سوں بدبوئی نہ لینا سو۔ بعض کی زبان سوں بد گوئی نہ کرنا سو۔ کینا کی شہوت کوں غیر جاگا فرچنا سو۔ پیر طبیب کامل ہوتا۔ نبض پہچان دوا دینا۔"

اس کے علاوہ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے دکنی اردو میں اور بھی رسائل ہیں۔ ان میں کئی ایک طبع بھی ہوئے مگر ان کے بارے میں محققین کو زیادہ معلومات حاصل نہ ہو سکیں ہاں معراج نامہ اور رسالہ سہ بارہ آج بھی موجود ہیں۔ ان رسائل کی عبارت کا ایک نمونہ پیش خدمت ہے۔ یہ نمونہ جات ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی کتاب سے اخذ کئے گئے ہیں۔

"تحقیق خدا کے بیاتے ستر ہزار پردے اوجیالے کے ہور اندھارے کے۔ اگر اس میانے ایک پردہ اٹھ جاوے تو اس کی آنچ تے میں جلوں۔"
(معراج نامہ)

سوال :۔ ایمان کی جھاڑاں کیا اور ڈالیاں کیا اور ایمان کے پات کیا اور ایمان کا وطن کیا اور ایمان کا بیج کیا اور ایمان کا پوست کیا اور ایمان کا سر کیا اور ایمان کا جیو کیا۔

جواب :۔ ایمان کا جیو قران۔ ایمان کی جڑ توبہ۔ ایمان کی ڈالیاں سو بندگی ایمان کی پات پرہیزگاری۔ ایمان کا تخم سو علم۔ ایمان کا پوست سو شرم۔ ایمان کا وطن سو مومن کا دل ہے۔
(رسالہ سہ بارہ)

شاہ میراں جی

حضرت شاہ میراں جی المعروف شمس العشاق مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے آپ نے مکہ معظمہ میں ہی درس حاصل کیا۔ وہاں کے علمی اور شرعی ماحول میں پرورش پائی۔ جوانی میں وہیں حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی شہرت کا حال سنا تو ان سے دلی لگاؤ پیدا ہو گیا۔ مکہ معظمہ سے چل کر ہندوستان تشریف لائے حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے خلیفہ اس وقت دکن میں قیام پذیر تھے۔ شاہ میراں جی بیجاپور میں ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان کے ہاتھ پہ بیعت کی۔

آپ کا نام نامی دکن کے ادبا، اتقیا اور صوفیائے کرام کی فہرست میں اوّل مقام رکھتا ہے۔ بیجاپور میں ہی آپ نے زندگی کے آخری سانس تک قیام فرمایا اور اسی شہر کو اپنا مرکز علم و تصوف بنایا۔ دورِ ابتدا کے بزرگانِ دین اور اہلِ علم میں سے شاہ میراں کا نام تاریخ اردو میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ آپ نے اپنی تصانیف نظم و نثر سے گلشن اردو کی بہت آبیاری کی۔ آپ کی نثری تصانیف میں سے گل باس، تلمی اہل ترنگ اور شرح مرغوب القلوب ہیں۔ عبارت کا نمونہ پیشِ خدمت ہے۔

"۔ خدکیا تحقیق مال اور پگڑے تمارے دشمن ہیں۔ چھوڑ دیو دشمناں کوں اے۔ کیا غفلت ہے جو تجھے اندھلا کیا موت کی یاد تے۔ تجھے بسر کر۔"

حضرت شاہ میراں جی کا "سب رس" نامی رسالہ بہت قدیم ہے۔ اس سے پہلے "سب رس" نام کا ایک رسالہ ملا وجہی نے بھی لکھا تھا۔ حضرت شاہ میراں اپنے رسالے "سب رس" میں تحریر فرماتے ہیں۔

"۔ اول تجھے جو کوئی سکھلاتا ہے اسے پوچھ۔ توں منجیں سکلانا سو تجھ پر کھلا ہے۔ اس کا کام اس پر نہیں کھلیا۔ سو تجھ پہ کیا کھلے گا۔ توں کیا سمجھ کر بھولیا ہے ہو سکیگا تر ادھر ادھر کہاں چار حکایتاں۔ اس حکایتاں سوں کیا حاصل۔"

شاہ میراں جی کا فرزند دلبند شاہ برہان الدین جانم ہے۔ آپ بھی بڑے پائے کے بزرگ گزرے ہیں۔ بہت بڑے ولی تھے۔ تصوف پر پوری دسترس رکھتے تھے۔ آپ نے سولہویں صدی عیسوی کے اخیر میں یعنی کوئی ۱۵۸۲ء میں وفات پائی۔ آپ نے مسائل تصوف پر کئی ایک رسالے تحریر کئے۔ ان میں ایک رسالے "کلمۃ الحقائق" کا نمونہ عبارت ہے۔

"۔ یہ نور الادھا سنا۔ ولیکن جیتا بکار ہو ٹوٹنے نہیں بلکہ سنتر بکار روپ دستا ہے۔ یک تل قرار نہیں۔ جیوں مرکٹ روپ۔"

اب ایک رسالے المعروف بہ گنج مخفی پر نگاہ ڈالتے ہیں۔ یہ رسالہ بھی تصوف کے مسائل کے بارے میں ہے اور اس میں شریعت کے علاوہ تصوف کے مختلف مسائل کو بیان کیا گیا ہے۔ اس رسالے کے مصنف شاہ برہان الدین جانم کے بیٹے اور جانشین ہیں جن کا اسم گرامی شاہ امین الدین اعلیٰ تھا۔ آپ کی وفات کا سن ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے ۱۶۷۵ عیسوی لکھا ہے۔ آپ بھی دکن ہی میں قیام پذیر رہے اور اسی جگہ رہ کر آپ نے تصنیف و تالیف اور درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ آپ کے مشہور رسالہ "گنج مخفی" کی زبان بھی دکنی اردو ہے۔ لکھتے ہیں ایک جگہ۔

"اللہ تعالیٰ نے گنجِ مخفی کو عیاں کرنا چاہا تو اول اس میں سوں ایک نظر نکلی۔ سو اس سے امین دیکھ ہوا۔ امین شاہد کہتے ہیں۔ یوں دونوں ذات سے دو ظہور ہیں۔ ذات نے اپس کو دیکھا۔ اسے نظر کہتے ہیں۔ دیکھ کر گواہی دیا تو اسے شاہد کہتے ہیں۔ یہ تینوں مرتبے ذات کے ہیں۔"

جوں جوں بزرگانِ دین اور نثر نگاروں کا سلسلہ آگے بڑھتا ہے ہم دیکھتے ہیں کہ نثر کی زبان زیادہ سہل ہوتی چلی گئی ہے۔ چنانچہ شاہ امین الدین اعلیٰ کے اس نمونہ نثر سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ دکنی اردو ان کے عہد تک پہنچ کر کس حد تک صاف اور آسان ہو گئی تھی۔

مذکورہ بالا نثر نگار، مصنفین اور بزرگانِ دین اور صوفیائے کرام کا تعلق دکن کی سلطنت عادل شاہی سے تھا۔ سلطنت بہمنیہ کو جب اقتدار پہ قبضہ جمائے چودہ پشتیں گزر گئیں تو آخر ایک حکمراں محمود شاہ کا دور آگیا اس کے دور میں سلطنت کمزور ہونا شروع ہوگئی۔ اسے زوال آنے لگا۔ اس کی کئی ایک وجوہات تھیں۔ ہمیں اس وقت ان وجوہات سے بحث نہیں ہے۔ اس وقت بیجاپور سلطنت بہمنیہ کا ایک صوبہ تھا اس صوبے کا گورنر یوسف عادل شاہ تھا۔ اس حاکم نے سلطنت کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے علم بغاوت بلند کر دیا اور ۱۴۹۰ عیسوی میں بیجاپور صوبے کا خود مختار حاکم بن بیٹھا۔ سلطنت بہمنیہ کے بادشاہ میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ اس کا مقابلہ کر سکتا۔ چنانچہ یوسف عادل شاہ حکمران بن گیا اور اس کے خاندان نے پورے دو سو برس تک حکومت کی۔ اس سلطنت کا نام سلطنت عادل شاہی تھا۔ یہاں تک کہ ۱۶۸۶ عیسوی میں اورنگ زیب عالمگیر نے یلغار کر کے بیجاپور کی حکومت کو ختم کر کے اسے مغل سلطنت کا حصہ بنا دیا۔

سلطنت عادل شاہی کا دور بھی بہت ادب پرور اور علم دوست دور تھا۔ بیجاپور کے دربار میں دنیا بھر سے آئے ہوئے علما و فضلا جمع رہتے تھے۔ لیکن اس دور میں ایک بڑی اہم اور دور رس تبدیلی ہوئی۔ جیسا کہ آپ جان چکے ہیں شمالی ہند کے بادشاہوں کی درباری زبان فارسی تھی۔ اس کے برخلاف سلطنت بہمنیہ کے بادشاہوں نے فارسی کی بجائے اردو کو درباری زبان بنایا تھا یہ سلسلہ بہت دیر تک چلتا رہا اور دکنی اردو کو ایک خالص ماحول میں آگے بڑھنے کے مواقع میسر آتے رہے۔ پھر جب یوسف عادل شاہ نے بغاوت کر کے بیجاپور کی حکمرانی کا اعلان کر دیا تو اس نے بھی درباری زبان اردو ہی رکھی۔ لیکن اس کے فوراً بعد دوسرے بادشاہ نے تخت سنبھالتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ درباری زبان اردو کی بجائے پھر سے فارسی کر دی۔ اس طرح کوئی ساٹھ ستر برس تک بیجاپور کی عادل شاہی حکومت کے درباروں، دفتروں اور عدالتوں میں فارسی زبان کا طوطی بولتا رہا۔

اس کے بعد ابراہیم عادل شاہ اول کا دور آگیا یہ ۱۵۵۸ عیسوی کا عہد ہے۔ ابراہیم عادل شاہ نے محسوس کیا کہ اگر دفتری زبان فارسی کی بجائے اردو ہو جائے تو زیادہ آسانی ہوگی اور کئی ایک پریشانیاں دور ہو جائیں گی۔ چنانچہ اس نے پھر سے فارسی کی جگہ اردو کو رائج کر دیا۔

یہ سلسلہ کچھ دیر تک جاری رہا۔ اردو کی قسمت کا ستارا ایک بار پھر چمک اٹھا۔ اہلِ علم اور اردو داں حضرات بہت خوش ہوئے اور انہوں نے دوبارہ بڑی گرمجوشی کے ساتھ دکنی اردو میں نظم و نثر کی تصنیف و تالیف کا کام شروع کر دیا۔ مگر شاید اردو نے ابھی زمانے کے کئی ایک گرم سرد تھپیڑے کھانے تھے۔ چنانچہ ابراہیم عادل شاہ ثانی جب تخت پر بیٹھا تو اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ درباری اور دفتری زبان کو اردو کی بجائے پھر سے فارسی کر دیا۔ لیکن اب اردو زبان کا تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ دکنی اردو عامۃ الناس میں بے حد مقبول ہو چکی تھی۔ اس کی جڑیں وقت کے سینے میں اتنی گہری ہو چکی تھیں کہ اسے آسانی سے اکھاڑا نہیں جا سکتا تھا۔ چنانچہ دکنی اردو میں شعر کہنے والوں اور نثر لکھنے والوں کی تعداد میں زبردست اضافہ ہو چکا تھا اور اردو زبان کا قافلہ اپنے ابتدائی دور سے نکل کر اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہو گیا تھا۔

سرگزشت زبان اُردو
ایک مختصر جائزہ

ہندوستان میں اردو زبان کی تاریخ بڑی قدیم ہے جیسا کہ اس سے پہلے آپ پڑھ چکے ہیں۔ اردو زبان بڑے کٹھن مراحل اور زمانے کے سرد و گرم میں سے گزری ہے۔ مختصراً ایک بار اردو زبان کا تاریخی جائزہ لیتے ہوئے ہم اسے تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں پہلا دور جب باہر سے حملہ آور ہندوستان میں آئے۔ آریا اور اس کے بعد مسلمان فاتحین۔ دوسرا دور جب مسلمانوں نے شمالی اور جنوبی ہند میں اپنی حکومتیں مستحکم کیں اور تیسرا دور جب مسلمانوں کی سلطنت کو زوال آیا اور اردو کا قافلہ بے سرو سامانی کے عالم میں دلی سے دبستان لکھنؤ کی طرف روانہ ہوا۔ جس وقت آریاؤں کے لشکر یہاں آئے تو اس وقت ہندوستان میں کئی صوبے تھے اور ہر صوبے میں اپنی الگ زبان بولی جاتی تھی۔ اس اعتبار سے شمال ہند اور جنوبی ہند اور مغربی گھاٹ کے علاقوں میں جو زبانیں بولی جاتی تھیں وہ آریاؤں کے حملوں سے بہت متاثر ہوئیں۔ آریا اپنی زبان سنسکرت اپنے ساتھ لائے تھے انھوں نے شمالی ہند کے قبیلوں کو جنوبی ہند کی طرف دھکیل دیا اور یہاں اپنی سلطنت قائم کر لی انہیں احساس برتری بہت تھا۔ اپنے حسب و نسب کے بارے میں اور اپنی زبان و ادب کے بارے میں بھی۔ وہ مفتوح علاقوں کی زبان سے اپنی زبان کو بچانا چاہتے تھے چنانچہ انھوں نے سنسکرت کو روزمرہ کی زندگی سے بلند رکھا۔

سنسکرت کو ویدوں اور مذہبی امور کی ادائیگی کے لئے مختص کر رکھا کسی بھی غیر آریائی کو اس زبان میں بات کرنے اور خط و کتابت کرنے کی اجازت نہ تھی۔ لیکن تاریخ کا سفر بڑا بے رحم ہوتا ہے۔ سنسکرت ہندوستان کی بھاشاؤں کی دست برد سے نہ بچ سکی۔ ایک وقت آیا کہ مقامی بولیوں سے مل کر ایک الگ زبان نے جنم لیا اور سنسکرت پر ایک مردہ زبان کا گمان ہونے لگا۔ آریاؤں نے کئی سو برس تک شمالی ہند پر حکومت کی۔ مہاراجہ اشوک سے پہلے سنسکرت زبان اپنی برتری کھونے لگی تھی لیکن اشوک نے سنسکرت کے تن مردہ میں ایک بار پھر روح پھونکنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں کالی داس ایسا باکمال شاعر اس کے ساتھ تھا۔ اشوک نے بدھ مت کے سٹوپا جگہ جگہ بنوائے اور ان پر بدھ کے اقوال کندہ کرائے۔ یہ اقوال سنسکرت زبان کے ساتھ ساتھ پالی زبان میں بھی تھے۔ کیونکہ تحقیق سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ گوتم بدھ پالی زبان میں ہی اپنے مریدوں کو درس دیا کرتا تھا۔ اس کے بعد آریاؤں کی حکومتیں مختلف صوبوں میں تقسیم ہو گئیں۔ آپس کی خانہ جنگیاں شروع ہو گئیں۔ سیاسی چپقلش اور عدم سالمیت نے باہر سے فاتحین کو دعوت دی۔ چنانچہ مسلمانوں کی آمد شروع ہو گئی۔ مسلمان فاتح بن کر یہاں آئے۔ مگر انھوں نے آریاؤں ایسی تنگ نظری سے کام نہیں لیا۔ بلکہ فراخ دلی سے یہاں کے رسم و رواج اور زبان کا مطالعہ کیا۔ ان کی زبان فارسی اور عربی تھی۔ اب ہندی پراکرت اور عربی فارسی کی آمیزش سے شمالی ہند اور دکن میں اردو نما زبان نے جنم لیا۔ دکنی زبان کے ڈانڈے بھی بعد میں شمالی ہند کی اس اردو نما زبان سے آن ملے دوسرے دور میں یہ دکھنی زبان عام بول چال میں آ گئی۔ شمالی ہند میں درباری زبان فارسی تھی دکن فتح ہوا تو بہمنیہ سلطنت کے دربار میں اردو نما ہندی یا دکنی اردو کو سرکاری سند مل گئی۔ عادل شاہ کے زمانے میں دکنی اردو سے یہ شاہی سند پھر چھن گئی اور فارسی درباری زبان ہو گئی۔ لیکن یہ بات زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔

عادل شاہ کے فوراً بعد عادل شاہی سلطنت کے دربار میں فارسی کی جگہ اردو کو درباری حیثیت حاصل ہو گئی اور ایک بار پھر اردو زبان بڑی تیزی سے ترقی کے مراحل طے کرنے لگی۔ اُردو کا تیسرا دور وہ ہے جب مغلیہ سلطنت ہندوستان میں مستحکم ہو گئی اور اردو نے دلی کو اپنا مسکن بنا لیا اور وہ اردوئے معلیٰ کہلانے لگی۔ یہ زبان ہندوستان کے گوشے گوشے پر چھا گئی۔ اگر ہم اردو زبان کی تاریخ پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ شروع کے زمانے میں اردو ہمیں بالکل ہندی نظر آتی ہے۔ کیونکہ ہندوستان کی زمین سے ہی اس بوٹے کی آبیاری ہوئی تھی۔ اس کا لباس اور تراش خراش اور وضع قطع خالص ہندوستانی تھی۔ دور متوسط میں یہ زبان مسلمانوں کی فارسی اور عربی سے بے حد متاثر ہوئی۔ یہاں تک کہ سارے کا سارا حلیہ ہی بدل گیا۔ اس میں ظاہری اور باطنی طور پر ایک زبردست انقلاب آ گیا مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد اردو زبان پر مغربی ممالک کے اثرات پڑنے لگے۔ چنانچہ اکثر اسلوب اور اصناف اس میں مغربی ادب سے آئیں۔ سلطنت مغلیہ کے عروج کے دور میں شعر کو درباری سرپرستی حاصل رہی۔ اردو کی نظم نے آگے بڑھنا شروع کیا اور بے حد ترقی کی۔ شعراء فکر معاش سے بے نیاز تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کی شاعری میں ہمیں معشوق کے سراپا کی تعریف اور انگیا کرتی ہی زیادہ نظر آتی ہے۔ یہ ایک تنزل کا عہد تھا جس میں اردو غزل ایک جگہ پر آ کر رک گئی تھی اور چند اصول اور مصنوعی اسالیب [illegible] بند ہو کر رہ گئی تھی۔ نیا خیال اور نئی ترکیبیں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی تھی

۱۸۵۷ کی جنگ آزادی کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں نئی نئی تحریکیں ابھرنا شروع ہو گئیں۔ اردو شاعری میں بھی انقلاب پیدا ہوا اور مخالف ماحول اور خوشگوار اثرات نے شعرائے جدید کو احساس نو بخشا اور یہ بتایا کہ زندگی ادب ہے اور ادب زندگی ہے۔ اُردو کے تن مردہ میں ایک بار پھر جان پڑ گئی اردو شاعری کا قالب بھی جنگ آزادی کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتا چلا گیا۔ اس دور کے شاعروں نے نئی زندگی اور نئے دور کے گیت گانے شروع کر دیئے۔ اردو زبان جو کنوئیں کا مینڈک بن کر رہ گئی تھی اچھل کر زندگی کے بحر بیکراں میں جا ملی۔ سیاسی حالات کا شکنجہ زیادہ کستا چلا گیا انفرادی اور سیاسی مسائل کی پیچیدگیاں بڑھتی چلی گئیں۔ آزادی خیال اور آزادی تقریر پر پہرے بٹھا دیئے گئے۔ اس لیے اردو شاعری میں نئے اسلوب اور نئے تجربوں کا دور شروع ہوا۔ جو بات کھل کر نہ کہی جا سکتی تھی اسے اشاروں کنایوں میں ادا کیا جانے لگا۔ اس طرح ایک نئی صنف نے جنم لیا۔ اردو زبان کو نئے اشارے، نئی رمزیں اور نئے کنائے مل گئے اور یوں قدیم اور جدید اسلوب کا فاصلہ بڑھتا چلا گیا۔ نظم کی قسم وہی رہی۔ اس کا ڈھانچہ وہی رہا لیکن بات پہلے سے زیادہ جوش اور حقیقت اور تجربے کے ساتھ ادا کی جانے لگی۔ یہ ایک دلی واردات تھی۔ ذہن اور احساس کا ایک نیا تجربہ تھا جس میں سے اردو زبان گذر رہی تھی۔ جو خیال پہلے کبھی شعر کے سانچے میں نہیں ڈھلے تھے وہ صفحہ قرطاس پہ بکھرنے چلے گئے۔ وہ موضوع جو اس سے پہلے کبھی شعر میں نہیں آئے تھے وہ مضامین جو نظم میں کبھی نہیں باندھے گئے تھے۔ سب کے سب نظم کی پہنائیوں میں آ کر سما گئے۔

یہی حال اردو نثر اور غزل کا تھا۔ نثر نگاروں میں قومیت کا اور آزادی کا ایک نیا شعور بیدار ہو رہا تھا۔ بیداری خیال کے جذبات نظم و نثر میں نمایاں تھے، اردو غزل، اردو نظم اور نثر کی تنگ نظری ختم ہو گئی تھی۔ دوسری جانب دنیا کے حقائق اور کائنات کے اسراروں پر سے بھی پردے اٹھتے چلے گئے۔ مغرب میں صنعتی انقلاب برپا ہو چکا تھا۔ اس کے دور رس اثرات نے اردو زبان، اردو ادب و

بھی بے حد متاثر کیا۔ یہ وہ سیلاب تھا جو ایک انقلابی عہد کو اپنے ساتھ لایا۔ اس دور کی اردو شاعری اور اردو نثر کا مزاج اس دور کے ہندوستان کی سیاسی کشمکش، سماجی حالات اور طرز معاشرت کا آئینہ دار ہے۔ شروع کے شاعروں نے پند و نصیحت اور اصلاح اخلاق کو اپنی نظموں کا موضوع خاص بنا لیا تھا۔ یہی حال نثر نگاروں کا تھا۔ نثر زیادہ تر مسائل تصوف کے بارے میں لکھی جاتی تھی۔ رسالے صوفیہ کے اقوال زریں سے بھرے ہوتے تھے۔ لیکن نئے دور کے شعرا نے پرانے مضامین کو ختم کر کے نئے مضامین باندھے اور عوام کو ایک نئی راہ سے روشناس کرایا۔ فرسودہ مضامین کو یک قلم ختم کر کے نئے خیالات کو اپنایا گیا۔ قدما اور متقدمین کے ہاں حزن و ملال ان کے اشعار کا مستقل موضوع تھا لیکن بعد کے شعرا اور نثر نگاروں نے حزن و ملال کی بجائے خوشگوار احساسات اور امید و بیم کو جگہ دی۔

اس دور کو ہم عہد انقلاب بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ اردو زبان کا سب سے بڑا انقلابی دور تھا کہ جب سلطنت مغلیہ کا چراغ گل ہو چکا تھا۔ انگریزی راج کا سورج ہندوستان کے وسط میں چمک رہا تھا۔ اس عہد میں ہم کو ایسے شاعر اور نثر نگار اور اردو زبان کے نقاد بھی خال خال دکھائی دیتے ہیں۔ جنہوں نے پرانے طرز احساس کو اپنا سہارا بنا رکھا تھا۔ انہوں نے غزل گوئی ہی کو اپنا موضوع بنایا اور ہمیں ان کی غزلوں میں سوائے حزن و ملال یاس و حسرت کے اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ قدیم پابندیوں کو اپنے اوپر وارد کیا بلکہ قدیم خیالات کو بھی جائز سمجھا۔ ان کی غزل اور ان کا فن ایک خاص ڈھانچے سے باہر نہ نکل سکا وہ اپنی ہی ذات کے اندر بند ہو گئے اور وہیں گھٹے گھٹے ماحول میں رہ کر ختم ہو گئے۔

ان شاعروں نے عہد انقلاب کے شاعروں سے اپنی غزل اور اپنے فن کو بچانے کی بہت کوشش کی مگر پھر بھی کہیں کہیں وہ بھی ہیں فرسودہ نظریات سے بغاوت کرتے نظر آتے تھے۔ انہوں نے جدید خیال کو اپنایا بلکہ یوں کہنا زیادہ صحیح ہو گا کہ جدید خیال کی انقلابی لہر نے انہیں بھی سوچنے پر مجبور کر دیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عاشقانہ خیال انسان کی رگ و پے میں سرایت کر گئے ہیں۔ تہذیب اور شائستگی کے دائرے میں رہ کر ان کا اظہار قابل قبول ہے مگر تہذیب اور شائستگی کا جس طرح ایک معیار، ایک حد ہوتی ہے اسی طرح سے معاملات عشق کو بیان کرنے کی بھی ایک حد ایک معیار مقرر ہے۔ عہد انقلاب کے بعد کے شاعروں نے اس معیار اور اس حد کو بھی پھلانگ دیا۔ اگرچہ اس دور میں اردو زبان کو بڑی ترقی ملی۔ اس کا دامن نئے خیال نئے فکر، نئے تجربوں اور نئے شعور سے بھر گیا لیکن اس کے زمین میں گڑے ہوئے پاؤں زمین پر سے اٹھ گئے۔ اب وہ ہمالیہ کی گود میں بیٹھ کر پرانے دنوں کو یاد کر رہی تھی۔

اس انقلابی دور میں اکثر شاعر ایسے بھی تھے جنہوں نے قافیہ ردیف کی قیود کو خیر باد کہہ کر نظم آزاد شروع کی۔ کسی نے فارسی بحروں کی جگہ ہندی بحریں پیدا کیے ترنم کو پیدا کرنے کی کوشش کی۔ کسی نے محاورات اور لفظوں کی بندشوں سے اپنے آپ کو آزاد کر لیا۔ اگر ہم اس دور کے تمام شعرا کا کلام اور سارے نثر نگاروں کے فن پاروں کا گہری نظر سے مطالعہ کریں ہمیں محسوس ہو گا کہ ان کی تہہ میں ایک شدید اضطراب اور بے یقینی کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ اس عہد میں ہمیں سیاسی اور سوشل بیداری کے ساتھ ساتھ زندگی اور جوانی سے پیار اور شباب سے محبت کا احساس بھی پوری شدت کے ساتھ جلوہ گر نظر آتا ہے۔ بلکہ یہ ایک طوفانی لہر تھی جو تقریباً ہر شاعر کو تھوڑی دور ضرور اپنے ساتھ بہا لے گئی۔ اس طوفان میں اکثر شعرا اور نثر نگار مغرب کی عریانیوں میں گم ہو گئے۔ کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے مغربی شاعری کے اسلوب کو اپنایا مگر مشرقی انداز اور طرز تکلم کو بالکل نہ چھوڑا۔ اس سلسلے میں ساغر نظامی، حفیظ اور اقبال کا شروع کا کلام ثبوت کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ اقبال اس کے بعد ہمیں بہت آگے نکلتا ہوا نظر آتا ہے اور پھر وہ اردو نظم و غزل کی تاریخی منزلوں سے گزرتا ہوا ایک ایسی منزل میں جا کر گم ہو جاتا ہے جہاں گم ہو جانے کی آرزو ہر مسلمان کے سینے میں چٹکیاں لیتی ہے۔

بنگال کے اس شباب پرور اور روح کی انفعالی کیفیت کا شاعر رابندر ناتھ ٹیگور ہے جبکہ اسی عہد میں اسی صوبے کا ایک اور شاعر قاضی نذرالاسلام ، اپنے ضیا بار اشعار سے نوجوانوں کے دلوں میں نیا خون پیدا کرنے کی مسلسل کوشش میں مصروف ہے ان دونوں رومانوی شاعروں نے اپنے ہم عصروں پر بڑا اثر ڈالا اس کا سب سے بڑا زیادہ اثر ہمیں اختر شیرانی میں ملتا ہے اختر شیرانی کے ہاں لفظوں کا آہنگ اور خوش بیانی دونوں چیزیں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ عہد انقلاب کے بعد ایک بے یقینی کا عہد آتا ہے۔ آیئے ذرا اس عہد کا بھی ایک سرسری جائزہ لے لیں۔

اس عہد میں حسن آفرینی اور حسن و عشق کے مضامین کو ایک بار پھر غزلوں اور نظموں کا موضوع بنایا۔ اس عہد کا شاعر حسن کو حسن منظوم کی صورت میں پیش کرتا ہے اس کے بعد وہ حسن کو عریانی کی حد تک بیان کرنے میں بھی عار محسوس نہیں کرتا یہ دور کشمکش اور جد و جہد کا دور ہے۔ معاشی ناہمواری سیاسی جوڑ توڑ اور معاشی بے انصافی کا احساس ہمیں ہر شعر، ہر غزل ہر نظم اور ہر ٹکڑا نثر میں ملتا ہے یہ دور انسان کی بے یقینی، بے اطمینانی اور دل و دماغ کی پریشانی کا دور ہے۔ زندگی کے کسی شعبے میں سکون میسر نہیں۔ زندگی کے راستے میں ہر موڑ پر کوئی نہ کوئی ہنگامہ سامنے کھڑا نظر آتا ہے۔ مذہب، سیاسیات، ادب اور دوسرے فنون لطیفہ اس ہنگامے سے متاثر نظر آتے ہیں۔ مغرب کی ہر شے کو ایک نیا فن پارہ سمجھ کر تسلیم کیا جا رہا ہے۔ مغرب کی ہر اچھی بری شے کو ایک خاص کشش اور دلکشی کا رنگ دے کر پیش کیا جاتا ہے اور ہمارا ہر نوجوان اسے حاصل کرنے کی کوشش میں مصروف دکھائی دیتا ہے۔

مشرقی روایات دم توڑتی نظر آ رہی ہیں۔ اس دور کا نوجوان اپنی روایات اپنی تہذیب اور اپنی معاشرت کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور اس کی تضحیک کرتا نظر آتا ہے۔ اس عہد کی شاعری مغربی اثرات کا شکار ہو کر رہ گئی۔ اگرچہ ہمارا جدید ادب ایک بڑی حد تک مغرب کا ممنون ہے مگر اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ ہم اپنی مشرقی روایات کو یکسر فراموش کر دیں۔ اس وقت ہم زندگی اور علم و فن کی دوڑ میں قدما سے بہت آگے نکل آئے ہیں۔ ہم ان کے ورثے کے جائز حقدار ہیں۔ ہمیں اس دور کے اساتذہ نے بہت کچھ دیا ہے انہوں نے ورثے کے طور پر ہمارے لیے بہت کچھ چھوڑا ہے اگرچہ ہم ان سے زیادہ سنگین مسائل سے دوچار ہیں لیکن اگر ہم بنظر غائر دیکھیں تو ترقی پسند ہونے کی بجائے ہم پہلے سے زیادہ قدامت پسند اور رجعت پسند ہوتے جا رہے ہیں کیونکہ ہمارے ادب میں ایک طبقہ ابھی تک مغربی ایوانوں کی مدح سرائی میں مصروف ہے اور یہ عمل کسی بھی قوم کے زندہ ادب کے لیے تنزل کی سب سے بڑی وجہ بن جاتا ہے۔

اردو کی پہلی گرامر

"تحفۃ الہند" نام سے برج بھاشا کی سب سے پہلی گرامر بھاشائی یا اردو یا دکنی اردو زبان میں لکھی گئی۔ یہ کتاب شہنشاہ اورنگ زیب کے زمانے میں اس کی فرمائش

پر تحریر کی گئی تھی اور یہ کتاب کبھی زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہوئی۔ اس کے قلمی نسخے مختلف لائبریریوں میں موجود ہیں۔ اس کتاب کے مصنف کا نام بعض قلمی نسخوں میں اعظم شاہ اور بعض قلمی نسخوں میں معزالدین جہاندار بتایا گیا ہے۔ دیباچہ مصنف نے خود تحریر کیا ہے۔ دیباچے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ یہ کتاب شہنشاہ اورنگ زیب کے کہنے پر اس کے شہزادوں کو اردو زبان کے قواعد اور گرامر سکھانے کے لیے لکھی گئی تھی۔ تعاند عرضی کی شرح "مفتاح النکات" کے مصنف نے بھی اس کتاب کا ذکر کیا ہے اور اس کے مصنف کا نام معزالدین جہاندار بتایا ہے۔ لسانی تحقیق و تدوین کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ازبس ضروری ہے کیونکہ اس کے مطالعے سے اردو زبان کے قدیم ترین قواعد سے شناسائی ہوتی ہے اس کتاب میں ایک دیباچہ اور سات ابواب ہیں مقدمہ میں برج بھاشا کے قواعد اور دیوناگری رسم الخط کے بارے میں تحقیق ہے دوسرے باب میں پنگل یعنی اہلِ ہند کے علم عروض کے بارے میں لکھا گیا ہے تیسرا باب النکار یعنی ہندوستان کے علم بیان کے بارے میں ہے۔ چوتھا باب سنگار رس یعنی اہلِ ہند کے علم محبت کے بارے میں ہے۔ چھٹا باب عورتوں کے بارے میں اور ساتواں باب سامدریک یعنی علم قیافہ پر ہے۔ خاتمے میں اہلِ ہند کے اشارے کنائے اور لغات درج ہے۔
کتاب کے مقدمے کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں دیوناگری رسم الخط کی تفصیل درج ہے۔ دوسرے حصے میں برج بھاشا کے قاعدے اور گرامر ہے۔ مصنف خود لکھتا ہے کہ وہ اس علم کا موجد ہے اور اس نے سب سے پہلی کتاب برج بھاشا کی گرامر کی لکھی ہے یہ ایک بات مصنف کے دعوٰی کی تصدیق کرتی ہے کہ اس سے پہلے برج بھاشا کی کسی گرامر کی کتاب کا سراغ نہیں ملتا۔

اس اعتبار سے اس کتاب کی تاریخی حیثیت ہے اور اردو زبان کے بارے میں لسانی تحقیق کرنے والوں کے لیے اس کی بڑی اہمیت ہے اس کتاب کے مطالعے سے یہ بھی علم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں کھڑی بولی اور برج بھاشا کا آپس میں کیا تعلق تھا۔ اس گرامر کی پہلی کتاب کے مصنف نے قدیم ہندی لفظوں کا تلفظ ویسے ہی اختیار کیا ہے جیسا کہ اس زمانے میں بولا جاتا تھا۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے ہندوستان کی کئی ایک زبانیں اس زمانے میں تھیں۔ یہ ساری کی ساری بولیاں تھیں اور ہندوستان کے ان گنت صوبوں میں الگ الگ بولی جاتی تھیں۔ لیکن وہ زبانیں جن میں اس زمانے میں بھی تصنیف و تالیف کا کام ہو رہا تھا تین تھیں۔ سنسکرت، پراکرت اور بھاشا۔

سنسکرت

جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں۔ آریاؤں کی زبان تھی۔ درباری سرکاری وزیروں، امیروں، پنڈتوں اور گنی گیانیوں کی زبان تھی۔ ہر طرح کی مذہبی اور دینی اور علم و دانش کی کتابیں اسی زبان میں لکھی جاتی تھیں۔ آریاؤں کا عقیدہ تھا کہ یہ زبان دیوتاؤں اور دیویوں کی زبان ہے وہ اسے آکاش بانی اور دیوبانی بھی کہا کرتے تھے۔ یعنی آسمان پر رہنے والوں کی زبان اور دیویوں دیوتاؤں کی زبان

پراکرت

شاعر، بادشاہوں، امیروں، وزیروں اور بڑے بڑے لوگوں کے قصیدے اسی زبان میں لکھتے تھے۔ قدیم اہلِ ہند اس زبان کو زمین کے نیچے رہنے والوں کی زبان بھی کہتے تھے۔ عالم سفل یعنی پاتال بانی اور ناگ بانی بھی اسے کہا جاتا تھا یعنی زمین کے اندر رہنے والے سانپوں کی زبان۔ یہ زبان اصل میں بھاشا اور سنسکرت سے مرکب ہے۔

برج بھاشا

اہلِ ہند نے شروع شروع میں عاشقانہ مضامین کو ادا کرنے کے لیے اسی زبان کو منتخب کیا۔ یہ اس دنیا کی زبان ہے جس میں ہم لوگ آباد ہیں۔ بھاشا کا اطلاق عام طور پر سنسکرت اور پراکرت کے سوا اور ساری زبانوں پر ہوتا ہے۔ خاص طور پر برج والوں کی زبان پر اطلاق ضرور ہوتا ہے۔ برج اصل میں ہندوستان کی سرزمین متھرا کو کہا جاتا ہے۔ شہر متھرا کے ارد گرد چاریل کے علاقے کو برج کا علاقہ کہا جاتا تھا اور اس علاقے میں جو زبان بولی جاتی تھی اسے برج بھاشا کے نام سے یاد کیا گیا۔ برج والوں کی زبان کو قدیم ہندوستان کی ساری زبانوں سے بڑھ کر مستند سمجھا گیا ہے۔ دریائے گنگا اور جمنا کے دوآبے کو بھی برج کے نام سے یاد کیا گیا۔ اس زبان میں عاشقانہ مضامین کو بڑی شد و مد کے ساتھ باندھا گیا۔ یہی زبان عوام کی بولی تھی اور الٰہ آباد سے لے کر وادی سرن اور اٹک تک بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ قدیم اردو شعر و ادب اس زبان میں تخلیق کیا گیا اس لیے مصنف لکھتا ہے کہ اس نے اسی زبان کی گرامر لکھنے کا فیصلہ کیا

شبد کا باب

مصنف لکھتا ہے کہ شبد سنسکرت زبان میں کلمے کو بولتے ہیں۔ برج بھاشا والے اسی کو شبد سے بولتے ہیں۔ یعنی بھاشا والے شبد کو شبد بولتے ہیں۔ ہمارے صرف و نحو کے ماہرین کی رائے میں کلمہ وہ ہے جو کسی معنی کو ادا کرنے کے لیے بولا جاتا ہے۔ ہندوستان والوں کی نگاہ میں اس کی تین قسمیں ہیں ۱۔ سنباون۔ ۲۔ کرکب۔ ۳۔ کرتا۔

سنباون اس کلمے کو کہتے ہیں جو ماضی حال اور مستقبل کسی سے کوئی تعلق نہ رکھتا ہو۔ اس کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو کسی نہ کسی معنی پر دلالت کرتا ہو اور دوسرا وہ جو کسی دوسرے لفظ کا محتاج نہ ہو۔ مثلاً رام جوان کے مشہور دیوتاؤں میں سے ایک دیوتا کا نام ہے۔ یا جل جس کے معنی پانی کے ہیں۔ اس قسم کے کلموں کو سنباون کہتے ہیں۔ عربی کی اصطلاح میں اس کو اسم کہتے ہیں۔ دوسرے وہ جو معنی پر دلالت کرنے میں کسی کا محتاج ہو۔ مثلاً پَرَ عربی اعلیٰ اور فارسی کے بَر کے معنی ہیں۔ اس قسم کے کلموں کو برت کہتے ہیں۔ عربی کی اصطلاح میں ان کو حرف کہتے ہیں۔

کرتب فعل کو کہتے ہیں اور فعل کے معنی ہیں کچھ کرنا۔ کرتب وہ کلمہ ہے جو تینوں زمانوں یعنی ماضی حال اور مستقبل میں سے کسی ایک سے تعلق رکھتا ہو۔ ان تینوں زمانوں کو ترکال بھی کہتے ہیں۔ کرتب کی پانچ قسمیں ہیں۔ بھوت۔ برتمان، بھوکھ کہیا اور کرت۔۔

بھوت

بھوت فعل ماضی کو کہتے ہیں اور فعل ماضی وہ ہے جو گزشتہ زمانے سے تعلق رکھتا ہو۔ فعل ماضی لازم چار صیغوں میں آتا ہے اور فعل لازمی وہ ہے کہ فعل اپنے فاعل پر تمام ہو جائے اور آگے بڑھ کر مفعول تک نہ پہنچے۔ وہ چار صیغے ہیں۔ ۱۔ آیئو۔ ۲۔ آئے۔ ۳۔ آئی۔ ۴۔ آئیں۔ آیئو: یہ صیغہ واحد مذکر غائب واحد مذکر حاضر اور واحد مذکر متکلم میں مشترک ہے۔ آئے۔ یہ صیغہ جمع مذکر غائب، جمع مذکر حاضر اور جمع مذکر متکلم میں مشترک ہے۔ آئی۔ یہ صیغہ واحد مؤنث غائب، واحد مؤنث حاضر اور واحد مؤنث متکلم میں مشترک ہے آئیں۔ یہ صیغہ جمع مؤنث غائب جمع مؤنث حاضر اور جمع مؤنث متکلم میں مشترک ہے۔

فعل متعدی بھی اسی طرح سے چار صیغوں میں آتا ہے اور فعل متعدی وہ ہے کہ فعل اپنے فاعل پر تمام نہ ہو بلکہ آگے بڑھ کر مفعول تک پہنچے۔ فعل متعدی کے صیغے مفعول کے اختلاف کے اعتبار سے مختلف ہوتے ہیں۔ یعنی اگر مفعول مذکر ہوتا ہے تو فعل مذکر لاتے ہیں اور اگر مفعول مؤنث ہوتا ہے تو فعل مؤنث لاتے ہیں۔ مثلاً اگر مفعول واحد مذکر ہو تو کہیں گے۔ ماریو۔ اور اگر مؤنث ہو تو کہیں گے ماری اور اسی قیاس پر باقی صیغوں کو سمجھ لینا چاہیے۔

برتمان کا بیان

برتمان فعل حال کو کہتے ہیں اور فعل حال وہ ہے جو گزشتہ اور آنے والے زمانوں کے درمیان ہو۔ فعل حال چار صیغوں

میں آتا ہے۔ ۱۔ کرت ہے۔ یہ صیغہ واحد مذکر غائب اور واحد مؤنث غائب اور واحد مذکر حاضر اور واحد مؤنث حاضر میں مشترک ہوتا ہے ۲۔ کرتُ ہیں۔ یہ صیغہ جمع مذکر غائب، جمع مؤنث غائب۔ جمع مذکر متکلم اور جمع مؤنث متکلم میں مشترک ہوتا ہے۔ ۳۔ کرتُ ہو۔ یہ صیغہ جمع مذکر حاضر اور جمع مؤنث حاضر میں مشترک ہے۔ ۴۔ کرتُ ہیں۔ یہ صیغہ واحد متکلم کا صیغہ ہے اور چاروں صیغوں میں لفظ کرت کی ت کو اگر مضموم پڑھیں تو مذکر کا صیغہ ہو جاتا ہے۔ اور اگر اس ت کو مکسور پڑھیں تو مؤنث ہو جاتا ہے۔

بھوکھیہ کا بیان

بھوکھیہ فعل مستقبل کو کہتے ہیں اور فعل مستقبل وہ ہے جو آئندہ زمانے سے تعلق رکھتا ہے۔ فعل مستقبل آٹھ عدد صیغوں میں آتا ہے۔ ۱۔ کرے گو۔ صیغہ واحد مذکر غائب اور صیغہ واحد مذکر حاضر میں مشترک ہے۔ ۲۔ کریں گے۔ یہ صیغہ جمع مذکر غائب اور جمع مذکر متکلم میں مشترک ہے۔ ۳۔ کروگے۔ یہ صیغہ مذکر حاضر کا صیغہ ہے۔ ۴۔ کروں گو۔ یہ صیغہ واحد مذکر متکلم کا صیغہ ہے۔ ۵۔ کروں گی۔ یہ صیغہ واحد مؤنث متکلم کا صیغہ ہے۔ ۶۔ کرے گی۔ یہ صیغہ واحد مؤنث غائب اور واحد مؤنث حاضر میں مشترک ہے۔ ۷۔ کریں گی یہ صیغہ واحد مؤنث غائب اور جمع مؤنث متکلم میں مشترک ہے۔ ۸۔ کروگی۔ یہ جمع مؤنث حاضر کا صیغہ ہے

کریا کا بیان

کریا چار طرح پر ہے۔ ۱۔ اسم بھاؤ۔ یہ اثبات فعل ماضی ہے۔ مثلاً آیو۔ ۲۔ اسم بھاؤ۔ یہ نفی فعل ماضی ہے جیسے نا یو۔ ۳۔ بھاؤ۔ یہ اثبات فعل حال و فعل مستقبل ہے۔ مثلاً کرت ہے کرے گو۔ وغیرہ ۴۔ ان بھاؤ یہ نفی فعل حال و فعل مستقبل ہے۔ نفی اور نہی کے لیے نون مفتوح (نہ) یا لفظ نا کلمے کے شروع میں لگا دیتے ہیں۔

کرت کا بیان

کرت مفعول کو کہتے ہیں اور مفعول وہ ہے کہ فعل اس پر واقع ہو۔ لازم ہو مفعول کے آخر میں ہ لاتے ہیں۔ مثلاً ہنو رام راونہ۔ یعنی رام نے راون کو مارا۔ اور کبھی مفعول کو فاعل سے پہلے لے آتے ہیں۔ مثلاً۔ ہنیو راونہ رام۔ اور کبھی ضمیر مفعول کو لفظ کے آخر سے حذف کر دیتے ہیں۔ مثلاً ہنیو رام راون۔ اس محل پر فاعل کو مفعول سے پہلے لانا بہتر ہے ورنہ قرینے اور قیاس پر نظر کر کے معنی نکال لیتے ہیں۔

کرتا کا بیان

کرتا فاعل کو کہتے ہیں اور فاعل فعل کرنے والا ہے۔ اس کی دو قسمیں ہیں ۱۔ سوادھین۔ وہ فاعل جو خود کام کرے۔ مثلاً کاجی یعنی کام کرنے والا۔ ۲۔ پرادھین۔ وہ فاعل جو کسی دوسرے کو فعل کرنے کا حکم دے۔ خواہ امر کے ساتھ ہو خواہ نہی کے ساتھ ہو اور امر کسی کو کام کرنے کا حکم دینا ہے اور نہی کسی کو کام کرنے سے روکنا ہے۔ امر حاضر تین صیغوں میں آتا ہے۔ ۱۔ کر۔ یہ امر واحد مذکر حاضر کا صیغہ ہے۔ ۲۔ کرِ۔ یہ امر واحد مؤنث حاضر کا صیغہ ہے۔ ۳۔ کرو۔ یہ صیغہ جمع مذکر حاضر اور جمع مؤنث حاضر میں مشترک ہے۔ امر غائب بھی تین صیغوں میں آتا ہے۔ ۱۔ کرے۔ یہ صیغہ واحد غائب مذکر اور واحد غائب مؤنث میں مشترک ہے۔ ۲۔ کریں۔ یہ صیغہ جمع غائب مذکر، جمع غائب مؤنث اور جمع متکلم میں مشترک ہے۔ ۳۔ کروں۔ یہ امر واحد متکلم کا صیغہ ہے۔ نہی حاضر و غائب کے بھی یہی امر حاضر و غائب کے چھ صیغے ہیں جن کے شروع میں نہ یا نا بڑھا دیتے ہیں۔

پُرُکھ لنگ کا بیان

پُرُکھ لنگ مذکر کو کہتے ہیں اور مذکر کے معنی ہیں مرد کے یا نر کے اس کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ۱۔ وہ جو عَلَم ہو اور اس کے مقابل میں کوئی مؤنث ہو۔ مثلاً رام اور کانھ جو مشہور دیوتاؤں کے نام ہیں اور عَلَم وہ ہے جو کسی معین شخص کا نام ہو۔ ۲۔ وہ کہ اسم مذکر غیر علم کے آخر میں الف لگا دیں مثلاً مرگا کہ لفظ مرگ (ہرن) پر الف بڑھا دیا۔

استری لنگ کا بیان

استری لنگ مؤنث کو کہتے ہیں اور مؤنث کے معنی ہیں عورت یا مادہ۔ اس کی دو قسمیں ہیں ۱۔ وہ جو عَلَم ہو مثلاً سیتا اور رادھا۔ جو کہ دو مشہور عورتیں ہیں۔ ۲۔ وہ معلوم نہ ہو۔ اس کی بھی دو قسمیں ہیں۔

۱۔ وہ جس کا مقابل کوئی مذکر اور نر ہو۔ مثلاً گھوڑی اور ہتھنی۔ ۲۔ وہ جس کا مقابل مذکر اور نر نہ ہو۔ مثلاً ہوا۔ آگ۔

یہ آخری قسم مؤنث سماعی ہے اور اس کا استعمال لفظ محاورے کے سننے سے تعلق رکھتا ہے۔ جب پُرُکھ لنگ کو استری لنگ یعنی مذکر غیر علم کو مؤنث کر دینا چاہتے ہیں تو مذکر اسم کے آخر میں چند حرف بڑھا دیتے ہیں۔ وہ حرف یہ ہیں۔

الف۔ مثلاً بڈھا سے بڈھیا
ب ۔ دیو سے دیوی
ت۔ مثلاً مہادیو سے مہادیورانی۔
ث۔ نی۔ مثلاً ترنگ سے ترنگنی۔ کبھی آخری ی گرا دیتے ہیں اور صرف نون باقی رہ جاتا ہے مثلاً: ترنگن۔

نپن سک لنگ کا بیان

نپن سک لنگ خنثیٰ یعنی نامرد کو کہتے ہیں۔ جو اکثر ہیں وہ جو حقیقت میں نہ مرد ہو نہ عورت ۔ محاورے میں ایسے گنتی کے چند اسم ہیں۔ ان سب کا ذکر طوالت کا باعث ہوگا۔ ان میں سے ایک لفظ کنڈل ہے جس کے معنی ہیں حلقہ۔ اس جنس کا استعمال سنسکرت کے محاورے سے مخصوص ہے یہ برج بھاشا میں مستعمل نہیں ہے۔

بہو بچن کا بیان

بہو بچن جمع کو کہتے ہیں اور واحد سے زیادہ کو جمع خیال کرتے ہیں۔ جمع بنانے کے لیے واحد لفظ کے آخر میں حرف نون لگا دیتے ہیں۔ مثلاً گلٹا سے گلٹن یعنی بدکار عورت۔ کر (ہاتھ) سے کرن اور پگ (پاؤں) سے پگن۔ اور جب لفظ کے آخر میں واؤ ساکن ہو تو کبھی اس کو اپنے حال پر ساکن رہنے دیتے ہیں اور کبھی اس پر زبر کی حرکت لگا دیتے ہیں۔ مثلاً سکھی سے سکھیں اور کبھی الف نون سے جمع بنا لیتے ہیں۔ مثلاً سکھی سے سکھیاں۔

اسم اشارہ کا بیان

اسم اشارہ وہ ہے جس سے کسی کی طرف اشارہ کریں اسمائے اشارہ سات ہیں۔

۱۔ وا۔ یہ واحد غائب کے اشارے کے لیے ہے مثلاً وہ
۲۔ تا۔ یہ بھی واحد غائب کے اشارے کے لیے ہے مثلاً وہ
۳۔ یا۔ یہ واحد حاضر کے اشارے کے لیے ہے مثلاً یہ
۴۔ جا۔ یہ بھی واحد غائب کے اشارے کے لیے ہے مثلاً جو
۵۔ اُن۔ یہ جمع غائب کے اشارے کے لیے ہے۔
۶۔ اِن۔ یہ جمع حاضر کے اشارے کے لیے ہے۔
۷۔ جنہ۔ یہ جمع غائب کے اشارے کے لیے ہے۔

یہ ساتوں کے ساتوں اسمائے اشارہ مذکر اور مؤنث دونوں میں مشترک ہیں۔

بدبرت کا بیان

بدبرت کلام کو کہتے ہیں اور کلام دو کلموں سے مشترک ہوتا ہے مثلاً رام آیو۔

سمبندھ کا بیان

سمبندھ ترکیب اضافی کو کہتے ہیں اور ترکیب اضافی وہ ترکیب ہے جس میں کلمہ اول کو کلمۂ ثانی سے نسبت ہو۔ اصطلاح عرب میں کلمۂ اول کو مضاف اور کلمہ ثانی کو مضاف الیہ کہتے ہیں۔ اہل ہند کی ترکیب اضافی تین کلموں سے مرکب ہوتی ہے۔ مثلاً پوتر رام کو۔ یعنی پسر رام کو۔ اس میں کلمہ پوتر مضاف ہے اور کلمہ رام مضاف الیہ اور لفظ کو جو آخر میں ہے علامتِ نسبت ہے۔ جو عربی زبان کی مثال لزید لام مکسور کی جگہ اور فارسی کی مثال غلام زید میں مضاف کے آخری کسرے کی جگہ آیا ہے۔ ہندی میں جب مضاف الیہ کو مضاف پر مقدم کرتے ہیں تو لفظ کو جو علامت نسبت ہے درمیان میں لاتے ہیں اور کہتے ہیں رام کو پوتر۔ اس عمل میں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ علامت نسبت کو حذف کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں رام پوتر۔

ان کلموں کا بیان جو اسموں کے شروع میں آکر بدل جاتے ہیں

۱۔ ا (الف مفتوح) اسم کے شروع میں آکر نفی اور سلبیت کے معنی دیتا ہے اور اس کو اصطلاح میں ناس یعنی نفی کہتے ہیں۔ مثلاً اجان یعنی نہ جاننے والا۔ نادان۔

۲۔ الف۔ اسموں کے درمیان میں آکر تواتر اور توالی کے معنی دیتا ہے مثلاً چلاچل یعنی زود ازو۔ یہ الف فارسی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

۳۔ ب (بائے مکسور) اسم کے شروع میں آکر نفی اور سلبیت کے معنی دیتا ہے مثلاً بیکل۔ یعنی بے قرار اور بے آرام۔ کیونکہ کل کے معنی ہیں قرار اور آرام۔

۴۔ س (سین مفتوح) اسم کے شروع میں آکر معیت اور ہمراہی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے مثلاً سجل یعنی سیراب اور شاداب۔ کیونکہ جل کے معنی ہیں پانی۔ یہ س کبھی لیاقت اور قابلیت کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً سپوت یعنی قابل اور رشید بیٹا اور یہ حرف اس معنی میں اس لفظ کے سوا اور کہیں نہیں سنا گیا۔

۵۔ سُ (سین مضموم) اسم کے شروع میں آکر خوب اور اچھا کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً سباس یعنی اچھی بو والا۔ خوشبودار۔

۶۔ کَ (کاف مفتوح) اسم کے اول میں آکر عدم لیاقت اور نا قابلیت کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً کپوت۔ یعنی نا قابل۔ نالائق۔ بیٹا۔

۷۔ کُ (کاف مضموم) اسم کے شروع میں آکر بد اور برا کے معنی دیتا ہے۔ کُرنگ یعنی بد رنگ۔ برے رنگ والا۔

۸۔ نِ (ن مکسور) اسم کے شروع میں آکر نفی اور سلبیت کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً نلج یعنی بے شرم بے حیا۔ کیونکہ لج اور لاج کے معنی ہیں شرم و حیا۔

اُن حرفوں کا بیان جو لفظوں کے آخر میں مختلف معنی دیتے ہیں

۱۔ الف۔ اسم کے آخر میں آکر وصفیت اور فاعلیت کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً کبتا۔ یعنی شاعر اور موصوف بصفت شاعری۔ کیونکہ کبت کے معنی ہیں شعر دلیا۔ دینے والا اور موصوف بصفت دہندگی۔ کبھی الف تانیث کے لیے آتا ہے۔ مثلاً بردھا یعنی بوڑھی عورت۔ کیونکہ بردھ بوڑھے مرد کو کہتے ہیں۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے اور کبھی تانیث کے ساتھ وصفیت اور فاعلیت کے معنی بھی دیتا ہے۔ مثلاً گربا یعنی غرور کرنے والی اور موصوف بصفت غرور۔ کیونکہ گرب کے معنی ہیں غرور اور الف تذکیر اور نر کا فائدہ دیتا ہے مثلاً ہرنا یعنی نر ہرن۔ اسم علم کے آخر میں الف ندا کا فائدہ دیتا ہے اور ندا کسی کو پکارنا ہے۔ مثلاً راما یعنی اے رام۔ الف ندائیہ عربی اور فارسی میں بھی استعمال میں آتا ہے۔

۲۔ ت۔ اسم کے آخر میں آکر مصدری معنی کا فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً گنت یعنی گنتا۔ شمار کرنا۔

۳۔ پ۔ اسم کے آخر میں آکر صاحبی اور خداوندی کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً بھوپ یعنی صاحب خداوند زمین۔ کیونکہ بھو کے معنی ہیں زمین۔

۴۔ ٹ۔ اسم کے آخر میں آکر فاعلیت کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً کھیوٹ یعنی ناؤ کھینے والا۔ اس ٹ کے آخر میں واؤ معروف بھی لگا دیتے ہیں۔ مثلاً کھیوٹو۔

۵۔ ج۔ اسم کے آخر میں آکر پیدا ہونے والے کے معنی دیتا ہے مثلاً بارج یعنی پانی سے پیدا ہونے والا۔ اس لفظ کا اطلاق کنول کے پھول پر اور ہر اس چیز پر ہوتا ہے جو پانی سے پیدا ہو۔ کیونکہ بار کے معنی ہیں پانی۔

۶۔ د (دال مکسور) اسم کے آخر میں آکر ظرف مکان کے معنی دیتا ہے مثلاً بارد۔ یعنی بادل۔ کیونکہ بار کے معنی پانی ہیں جیسا ابھی بتایا جا چکا ہے۔

۷۔ دھ۔ یہ بھی اسی معنی کا فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً انبدھ یعنی سمندر کیونکہ انب کے معنی ہیں پانی۔ یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ پانی کے معنی دینے والے اسم کے آخر میں د بادل کے معنی اور دھ سمندر کے معانی کا فائدہ دیتا ہے۔

۸۔ ک۔ اسم کے آخر میں آکر فاعلیت کے معنی دیتا ہے مثلاً سیوک یعنی خادم۔ کیونکہ سیو اور سیوا کے معنی ہیں خدمت۔ یہ کاف کبھی مصدری معنی کا فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً بیدک یعنی طبابت۔

۹۔ گ۔ اسم کے آخر میں آکر راہ روش اور رفتار کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً اُرگ یعنی سینے کے بل چلنے والا۔ کیونکہ اُر کے معنی ہیں سینہ۔ اس لفظ سے سانپ مراد لیتے ہیں۔

۱۰۔ ن۔ اسم کے آخر میں مصدری معنی فائدہ دیتا ہے مثلاً چلن یعنی رفتن و رواج کیونکہ چل اور چال کے معنی ہیں رفتار اور طریقہ۔ حرف نون کبھی فاعلیت کا فائدہ بھی دیتا ہے۔ مثلاً موہن یعنی موہنے والا۔ فریفتہ کرنے والا۔ کیونکہ موہ کے معنی ہیں فریفتگی اور کبھی جمع کا فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً کرن جو کر کی جمع ہے اور کر کے معنی ہیں ہاتھ اور کبھی تانیث کا فائدہ دیتا ہے مثلاً ترنگن یعنی گھوڑی۔ کیونکہ ترنگ کے معنی ہیں گھوڑا۔

۱۱۔ و (واؤ معروف) اسم کے آخر میں آکر فاعلیت کا فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً پاہرو۔ یعنی پہرہ دینے والا۔ پاسبان۔ کیونکہ پہرہ اور پاہرہ کے معنی ہیں پاسبانی اور نگہبانی۔

۱۲۔ ہ (ہائے مکسور)۔ اسم کے آخر میں آکر مفعول بہ کے معنی دیتا ہے مثلاً داہِ یعنی اس کو۔ کیونکہ دا کے معنی ہیں وہ۔

۱۳۔ ی (یائے معروف) اسم کے آخر میں آکر نسبت کا فائدہ دیتا ہے مثلاً اجمیری۔ یعنی منسوب بہ اجمیر۔ اجمیر ہندوستان کے ایک مشہور شہر کا نام ہے۔

اور یہ فارسی میں بھی مستعمل ہے۔ کبھی ی صفت اور فاعلیت کا فائدہ دیتی ہے۔ مثلاً گربی یعنی غرور کی صفت سے موصوف غرور کرنے والا۔ کیونکہ گرب کے معنی ہیں غرور۔ کبھی ی تانیث کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً دیوی۔ یعنی دیو کی عورت جیساکہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے۔

اُن کلموں کا بیان جو اسموں کے شروع میں آکر مختلف معنی دیتے ہیں

ا۔ وہ کلمے جو اسم کے شروع میں آکر ندا کے معنی دیتے ہیں۔ یہ دس کلمے ہیں۔

۱۔ ہے۔ مثلاً ہے رام۔ ۲۔ اہے۔ مثلاً اہے رام ۳۔ ہو۔ مثلاً ہو رام۔ ۴۔ آہو۔ مثلاً آہو رام ۵۔ اِے۔ مثلاً اِے رام۔ یہ کلمہ فارسی میں بھی مستعمل ہے۔ ۶۔ اِے ہو۔ جو اے اور ہو سے مرکب ہے۔ مثلاً اے ہو رام۔ ۷۔ ارے۔ مثلاً ارے رام۔ اس کلمے کو مؤنث کی ندا میں یائے معروف سے بولتے ہیں مثلاً اری سکھی۔ اور سکھی کے معنی ہیں عورت یا زن۔ ۸۔ اے۔ یعنی الف اوّل کے مثلاً اے رام۔ اس کلمے کو بھی ندائے مؤنث میں یائے معروف سے بولتے ہیں۔ مثلاً اے ری سکھی ۹۔ اے رے۔ جو اے اور رے سے مرکب ہے مثلاً اے رے رام۔ ندائے مؤنث کے لیے اس کے دوسرے جزو رے کو یائے معروف سے بولتے ہیں مثلاً اے ری سکھی ۱۰۔ ارے اے۔ جو ارے اور اے سے مرکب ہے مثلاً ارے اے رام۔ ندائے مؤنث کے لیے اس کے پہلے جزو ارے کو یائے معروف سے بولتے ہیں۔ مثلاً اری اے سکھی۔

ب۔ وہ کلمے جو اسم کے شروع میں آکر نفی اور سلبیت کا فائدہ دیتے ہیں۔ یہ دو کلمے ہیں۔

(۱) نِر۔ مثلاً نِربھو یعنی بے خوف کیونکہ بھَو کے معنی ہیں خوف کے۔

(۲) اَن۔ مثلاً اَن رس یعنی بے مزہ، بے ذوق۔ کیونکہ رس کے معنی مزہ اور ذوق کے ہیں۔

اُن کلموں کا بیان جو اسموں کے آخر میں آکر مختلف معنی دیتے ہیں

ا۔ وہ کلمے جو اسم کے آخر میں آکر صاحبی اور خداوندی کے معنی دیتے ہیں۔ یہ دس کلمے ہیں۔

۱۔ وَنت۔ مثلاً روپ ونت۔ یعنی صاحب جمال وحسن۔ کیونکہ روپ کے معنی ہیں حسن وجمال کے۔ کبھی مذکر کے لیے اس کلمے کے آخر میں الف لگا دیتے ہیں اور کہتے ہیں روپ ونتا اور مؤنث کے لیے یائے معروف لگا دیتے ہیں جیسے روپ ونتی۔

۲۔ کار۔ مثلاً گُن کار یعنی صاحب علم وہنر۔ کیونکہ گُن کے معنی ہیں علم وہنر کے۔

۳۔ پال۔ مثلاً بھوپال۔ یعنی صاحب زمین وملک۔ بادشاہ۔ زمیندار اور صاحب جائیداد۔ کیونکہ بھو کے معنی ہیں زمین۔

۴۔ پَت۔ مثلاً بھوپت یعنی صاحب زمین اور صاحب مملکت۔ اس لفظ کا اطلاق بھی صاحب جائیداد اور صاحب مملکت پر کرتے ہیں کیونکہ بھو کے معنی ہیں زمین۔ قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ جب زمین۔ جگ۔ دنیا اور مرد کے معنی دینے والے اسموں کے آخر میں پت کا لفظ آتا ہے تو وہ بادشاہ کے معنی کا فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً بھوپت۔ دیس پت۔ جگ پت۔ نرپت۔ کلمہ کنت بھی ان اسموں کے آخر میں اسی معنی کا فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً بھوکنت۔ کلمہ پت جب تارہ اور رات کے معنی دینے والے اسموں کے آخر میں آتا ہے تو چاند کے معنی کا فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً تارپت۔ نکھترپت اور رجنی پت اور کلمہ پت جب ندی کے معنی دینے والے اسم کے آخر میں آتا ہے تو دریا کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً ندی پت۔

۵۔ ایس۔ جب اس کلمے کو کسی دوسرے کلمے سے ملاتے ہیں تو لکھنے میں الف کو حذف کر دیتے ہیں۔ کیونکہ قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ جس کلمے کے شروع میں الف ہوتا ہے۔ جب اس کو کسی دوسرے کلمے سے وصل کرتے ہیں تو الف کو حالت تحریر میں حذف کر دیتے ہیں۔ مثلاً مہیس۔ یعنی صاحب زمین۔ کیونکہ مہی اور مہہ کے معنی ہیں زمین۔ اس کلمے کو بادشاہ اور صاحب زمین پر بھی اطلاق کرسکتے ہیں۔

۶۔ ایشر۔ مثلاً کابیشر۔ یعنی صاحب شعر۔ کیونکہ کاب کے معنی شعر کے ہیں۔ سنسکرت میں لفظ ایشر کو شین کے ساتھ بولتے ہیں۔

۷۔ اند۔ مثلاً نرند۔ صاحب مرداں۔ کیونکہ نر کے معنی مرد کے ہیں۔

۸۔ راج۔ مثلاً کب راج۔ یعنی ملک الشعرا۔ کیونکہ کب کے معنی ہیں شعر۔

۹۔ آیت۔ مثلاً ڈھالیت۔ یعنی صاحب سپر یعنی ڈھال۔

۱۰۔ آوَت۔ مثلاً لچھماوت۔ یعنی دولت والی عورت۔ کیونکہ لچھمی دولت کی دیوی کو کہتے ہیں اور ت کے آخر میں یائے معروف بھی لاتے ہیں۔ مثلاً لچھماوتی اور یہ کلمہ کنول کے معنی دینے والے اسم کے آخر میں پدمنی فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً پدماوتی۔

ب۔ وہ کلمے جو اسموں کے آخر میں آکر فاعلیت کے معنی کا فائدہ دیتے ہیں

ایسے کلمے پانچ ہیں۔

۱۔ آیا (ی کی تشدید کے ساتھ) مثلاً کھلیا۔ یعنی کھیلنے والا۔

۲۔ وار۔ مثلاً کھلوار۔ یعنی کھیلنے والا۔

۳۔ آر۔ مثلاً کِھلار یعنی کھیلنے والا۔ اس کے آخر میں یائے معروف بھی لاتے ہیں۔ مثلاً کھلاری۔

۴۔ آک۔ مثلاً پیراک۔ یعنی پیرنے والا۔

۵۔ اُو۔ مثلاً بٹاؤ یعنی راستہ چلنے والا اور مسافر۔

ج۔ وہ کلمے جو اسموں کے آخر میں آکر مصدری معنی کا فائدہ دیتے ہیں

ایسے آٹھ کلمے ہیں۔

(۱)۔ بُو۔ مثلاً بولبو یعنی بولنا۔

(۲) آئی۔ یعنی ترنائی۔ یعنی جوانی۔ کیونکہ ترُن کے معنی ہیں جوان۔

(۳) آپُو۔ مثلاً مُٹاپُو۔ یعنی فربہی۔ کیونکہ فربہ کے معنی ہیں موٹا۔ روزمرہ بول چال میں اس لفظ کے آخر والے واؤ کی جگہ الف کا استعمال کرتے ہیں مثلاً مٹاپا۔

(۴) پَن۔ مثلاً بال پَن یعنی بچپن۔ پَن کے آخر میں واؤ مجہول اور نون غنہ بھی لگاتے ہیں اور کہتے ہیں بال پنوں۔ روزمرہ کی بات چیت میں واؤ مجہول کی جگہ الف استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً بال پنا۔

(۵) اَوْں۔ مثلاً آونوں یعنی آنا۔ روزمرہ کی بول چال میں واؤ کی جگہ الف استعمال کرتے ہیں اور کہتے ہیں آوناں۔

(۶) پَت۔ مثلاً چکن پت۔ یعنی رعنائی زیبائی۔ خود نمائی۔

(۷) آپ۔ مثلاً ملاپ۔ یعنی ملنا ملاقات کرنا۔
(۸) آؤ۔ مثلاً بناؤ یعنی بنانا۔ سنوارنا۔ سنگار کرنا۔

د- وہ کلمے جو اسموں کے آخر میں آکر وصفیت کے معنی دیتے ہیں

ایسے دس کلمے ہیں۔

(۱) تانی۔ مثلاً سیام تانی۔ یعنی سیاہی۔ کیونکہ سیام کے معنی ہیں سیاہ۔ اس کلمے کے دوسرے جزو تی کے بغیر بھی بولتے ہیں جیسے سیاتتا۔

(۲) آٹ۔ مثلاً چکناٹ۔ یعنی چکنے ہونے کی صفت۔

(۳) آوٹ۔ مثلاً مہراوٹ۔ یعنی زنانہ پن۔ کیونکہ مہری کے معنی ہیں عورت۔

(۴) آس۔ مثلاً مٹھاس۔ یعنی میٹھے ہونے کی صفت۔

(۵) ایل۔ مذکر کے لیے لام کے آخر میں واؤ مجہول لگاتے ہیں اور کہتے ہیں رنگیلو یعنی رنگینی کی صفت سے موصوف مرد۔ روزمرہ کی بول چال میں واؤ کی جگہ الف لگاتے ہیں اور کہتے ہیں رنگیلا۔ مؤنث کے لیے یائے معروف لگا دیتے ہیں اور کہتے ہیں رنگیلی۔ یعنی رنگینی کی صفت سے موصوف عورت۔

(۶) سار۔ مثلاً ملنسار۔ یعنی ملاقات یا میل جول کی صفت سے موصوف۔

(۷) کا۔ یہ لفظ صرف مؤنث کے لیے مخصوص ہے مثلاً ابھیسارکا۔ یعنی بدکاری کی صفت سے موصوف عورت۔ کیونکہ ابھیسار کے معنی ہیں بدی۔ برائی۔

(۸) آیوں۔ مثلاً ڈھیٹیایوں۔ یعنی ڈھیٹ پنے کی صفت۔

(۹) اُول۔ مذکر کے لیے لام کے آخر میں واؤ مجہول لگا دیتے ہیں اور کہتے ہیں منجھولو۔ یعنی بھلا ہونے کی صفت سے موصوف۔ روزمرہ کی بات چیت میں واؤ مجہول کی جگہ الف استعمال کرتے ہیں اور کہتے ہیں منجھولا۔ مؤنث کے لیے یائے معروف لگا کر کہتے ہیں منجھولی۔

(۱۰) اگو ہاں۔ مثلاً جگوہاں۔ یعنی نیم رنگ سرخی کی صفت سے موصوف مرد۔ کیونکہ جگو۔ نیم رنگ سرخ کو کہتے ہیں۔ مؤنث کے لیے اس لفظ میں الف کی جگہ یائے معروف لاتے ہیں۔ مثلاً جگوہیں۔ یعنی مذکورہ صفت سے موصوف عورت۔

وہ کلمے جو اسموں کے آخر میں آکر تصغیر کا فائدہ دیتے ہیں

عربی کی اصطلاح میں تصغیر کسی کو چھوٹا کرنا کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔
یہ کلمے چار ہیں۔

(۱) ڑا۔ مثلاً لنگر سے لنگڑا اور لنگ کے معنی ہیں شوخ۔ مؤنث کی تصغیر کے لیے ڑا کی جگہ یا لاتے ہیں۔ مثلاً گاگر سے گاگریا اور گاگر کے معنی ہیں گھڑا۔ کلمہ یا مذکر کے لیے نسبت کا فائدہ دیتا ہے مثلاً کنوجیا یعنی کنوج کی طرف منسوب مرد۔ کنوج ہندوستان کا ایک شہر ہے۔

(۲) را۔ مثلاً مینہ سے مہرا اور مینہ کے معنی ہیں بارش۔

(۳) اونا۔ مثلاً ڈھوٹا سے ڈھوٹونا۔ ڈھوٹا کے معنی ہیں لڑکا۔

(۴) اوٹا۔ مذکر کے لیے اس کلمے کے آخر میں واؤ مجہول لاتے ہیں اور کہتے ہیں کلوٹو اور کبھی اس کلمے میں واؤ معروف کی جگہ مجہول بھی لاتے ہیں مثلاً بھروٹو۔ یعنی چھوٹی گٹھڑی۔ ان دونوں صورتوں میں روزمرہ کی بول چال میں آخری واؤ مجہول کی جگہ الف استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً کلوٹا اور بھروٹا اور مؤنث کے لیے الف کی جگہ یائے معروف لگاتے ہیں۔ مثلاً کلوٹی اور بھروٹی۔

وہ کلمے جو اسموں کے آخر میں آکر دارندگی کے معنی دیتے ہیں

یہ دو کلمے ہیں۔

(۱) دھر۔ مثلاً گردھر۔ یعنی دارندہ کوہ۔ گردھر کانھو کا نام ہے کیونکہ کہا جاتا ہے کہ کانھو نے ایک وقت پہاڑ کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا تھا۔ اس وجہ سے اس کا نام گردھر ہو گیا۔ یہ کلمہ زمین کے معنی دینے والے اسم کے آخر میں پہاڑ کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً دھرادھر۔ یعنی دارندہ کوہ۔ کیونکہ دھرا کے معنی ہیں زمین اور امرت یعنی آبِ حیات کے معنی دینے والے اسم کے آخر میں چاند کے معنی دیتا ہے مثلاً سُدھا دھر۔ اور چاند کے معنی دینے والے اسم کے آخر میں مہادیو کے معنی دیتا ہے مثلاً سسی دھر۔

(۲) دھاری۔ مثلاً جٹا دھاری۔ یعنی جٹا رکھنے والا اور جٹا کے معنی ہیں سر کے بال۔ جو آپس میں چپک کر ایک ہو گئے ہیں۔

وہ کلمے جو اسموں کے آخر میں آکر دہندگی کے معنی دیتے ہیں

یہ دو کلمے ہیں۔
۱۔ دائی۔ مثلاً دکھ دائی۔ یعنی رنج دینے والا۔
۲۔ دائک۔ مثلاً سکھ دائک۔ یعنی سکھ دینے والا۔

وہ کلمے جو اسموں کے آخر میں آکر کنندگی کے معنی دیتے ہیں

یہ دو کلمے ہیں۔
۱۔ کر۔ مثلاً دن کر۔ یعنی دن کرنے والا۔ اس کا اطلاق آفتاب پر کرتے ہیں۔
۲۔ کرتا۔ مثلاً گن کرتا۔ یعنی فائدہ کرنے والا۔

وہ کلمے جو اسموں کے آخر میں آکر لے بھاگنا کے معنی دیتے ہیں

یہ دو کلمے ہیں۔

۱۔ ہر۔ مثلاً من ہر یعنی دلربا۔ دل لے لینے والا۔ اس کلمے کے آخر میں نون بھی لگا دیتے ہیں اور کہتے ہیں من ہرن۔ اور مؤنث کے لیے نون کے بعد یائے معروف لگا دیتے ہیں اور کہتے ہیں من ہرنی یعنی دلربا عورت۔

۲۔ ہرتا۔ مثلاً بلائے ہرتا۔ یعنی بلا کا دور کرنے والا۔

وہ کلمے جو اسموں کے آخر میں آکر مختلف معنی دیتے ہیں

۱۔ ہار۔ ایک کلمہ ہے جو کسی اسم کے آخر میں آکر لیاقت اور سزاواری کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً ہون ہار۔ یعنی ہونے کے لائق۔ شدنی۔

۲۔ آوٹ۔ ایک کلمہ ہے جو اسم کے آخر میں آکر آلے کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً کسوٹ۔ یعنی وہ سنگ جس سے کسائی کی جائے۔ مذکر کے لیے اس کلمے کے آخر میں یائے معروف لگاتے ہیں اور کہتے ہیں کچھوٹا۔ یعنی وہ چیز جس سے ستر عورت کیا جائے یعنی آگا پیچھا چھپایا جائے کیونکہ کاچھ کے معنی ہیں عورت۔ یعنی جسم کا وہ حصہ جس کو چھپا رہنا چاہیے۔ اور مؤنث کے لیے اس کلمے کے آخر میں یائے معروف لگانے

ہیں۔ مثلاً کسوٹی۔ یعنی وہ شے جس سے سونا چاندی پرکھا جاتا ہے۔ کیونکہ کس کے معنی ہیں پرکھنا۔ کبھی یہ کلمہ ظرفیت کے معنی بھی دیتا ہے۔ مثلاً کجروٹی یعنی وہ شے جس میں کاجل یا سرمہ رکھتے ہیں۔

۳۔ بن۔ ایک کلمہ ہے جو اسم کے آخر میں آکر بے اور بغیر کے معنی دیتا ہے۔ جیسے لال بن۔ یعنی بے معشوق۔ لال کے معنی ہیں معشوق۔ اس کلمے کے آخر میں الف نون بھی بڑھا دیتے ہیں اور کہتے ہیں۔ لال بناں۔ اس کلمے کو کبھی اسم سے پہلے بھی لاتے ہیں اور کہتے ہیں لال اور بناں لال۔

۴۔ سالا۔ ایک کلمہ ہے جو اسم کے آخر میں آکر ظرف مکان کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً دھرم سالا۔ یعنی عبادت، خیرات، دینداری اور خدا پرستی کی جگہ۔ اس کلمے کو کبھی بغیر آخری الف کے بھی استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً ٹک سال یعنی سکے بنانے اور سونے چاندی کے پرکھنے کی جگہ۔

۵۔ آہند۔ ایک کلمہ ہے جو اسم کے آخر میں آکر بو کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً مچھلاہند۔ یعنی مچھلی کی سی تیز بو۔ بری بو۔

۶۔ چہ۔ ایک کلمہ ہے جو درخت کے معنی دینے والے اسم کے آخر میں آکر ہرن اور بندر کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً رکھ چہ اور جنگل بیابان کے معنی دینے والے اسم کے آخر میں آکر یہی جنگلی اور بیابانی کے معنی دیتا ہے مثلاً بن چہ۔ پانی کے معنی دینے والے اسم کے آخر میں آکر ابر و باراں کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً جل چہ اور رات کے معنی دینے والے اسم کے آخر میں آکر بھوت کے معنی دیتا ہے مثلاً رین چہ۔

۷۔ مٹی۔ ایک کلمہ ہے جو اسم کے آخر میں آکر کثرت کے معنی کا فائدہ دیتا ہے مثلاً جل مٹی۔ یعنی وہ جگہ جہاں کئی دریا بہتے ہوں۔ یا ایسا دریا جس میں بہت زیادہ پانی ہو۔ کیونکہ جل کے معنی پانی کے ہیں۔

۸۔ انش۔ ایک کلمہ ہے جو اسم کے آخر میں آکر حصہ کے معنی دیتا ہے۔ جیسے دسوانش۔ یعنی دسواں حصہ۔

۹۔ اَوتی۔ ایک کلمہ ہے جو اسم کے آخر میں آکر مقدار اور اندازے کے معنی دیتا ہے۔ جیسے سمجھوتی یعنی سمجھنے کی مقدار اور اندازہ۔

• • •

زبان اردو کے مآخذ

اردو زبان کو پنجابی زبان سے بے تعلق کرنا ایک تاریخی حقیقت سے انکار کرنا ہے۔ اس لیے کہ جتنا گہرا اور اٹوٹ تعلق اردو کا پنجابی زبان سے ہے اور کسی زبان سے نہیں ہے ۱۹۲۸ء میں پروفیسر حافظ محمود شیرانی نے "پنجاب میں اردو" لکھ کر اس حقیقت کی ماہرانہ تحقیق کی اور ثابت کیا کہ اردو زبان کے ماخذوں میں سے پنجابی زبان ایک بہت اہم اور ناقابل فراموش ماخذ ہے۔ یہ کہنا کلی طور پر درست نہیں ہے کہ اردو زبان کے ماخذ صرف ہندی یا برج بھاشا یا اسلامی زبانیں ہیں۔ اصل میں اس قسم کی غلط فہمیاں زیادہ تر یورپی محققین کی وجہ سے پیدا ہوئی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ غیر ملکی ماہرین لسانیات اور محققین نے اردو کی تحقیق کے سلسلے میں بڑا کام کیا ہے لیکن انہوں نے اس سلسلے میں بہت سی غلط فہمیاں بھی پیدا کر دیں۔ ڈاکٹر محی الدین زور کے الفاظ میں۔

"جس زمانے میں اردو پنجاب میں بنی اس وقت پنجاب اور دوآبہ گنگ و جمن کی زبان میں بہت کم فرق پایا جاتا تھا۔ برج بھاشا، کھڑی بولی اور جدید پنجابی زبانیں بعد کو عالم وجود میں آئیں۔ محمود شیرانی کی کتاب کے شائع ہونے کے بعد یعنی ۱۹۲۸ء کے بعد سے اہل اردو اور ماہرین لسانیات کے نقطہ نظر میں تبدیلی پیدا ہو گئی اور اردو کے سرزمین پنجاب میں پیدا ہونے اور لسانیاتی نشو و نما پانے کا نظریہ مستحکم بن گیا۔"

پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی نے ۱۹۴۲ء میں اپنی کتاب "کیفیہ" شائع کی جس میں انہوں نے بھی اس خیال کی زبردست تائید کی کہ اردو کی پیدائش کے وقت شمالی اور شمال مغربی ہندوستان کی زبان تقریباً ایک ہی تھی۔ لیکن ساتھ ہی شاید دہلوی ہونے کی وجہ سے اس واقعہ کا صاف طور پر اعتراف نہیں کیا کہ اردو پنجاب ہی میں پیدا ہوئی بلکہ قدرا دامن بچاتے ہوئے لکھ دیا۔

"راقم کا ہرگز یہ منشا نہیں کہ کسی خاص مقام یا خطے کو اردو کا مولد ہونے کے امتیاز سے محروم کر دیا جائے یا یہ طرۂ امتیاز ایک سے چھین کر دوسرے کی دستار سے لٹکا دیا جائے۔"

لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ پنڈت جی نے بھی اردو کے پنجاب میں پیدا ہونے کی مخالفت نہیں کی بلکہ ایسے حوالے اور اسما و افعال کی مثالیں دیں کہ جن سے اردو اور پنجابی کا گہرا تعلق ثابت ہوتا ہے۔ اس سے پہلے مولانا سلیمان ندوی کی نقوش سلیمانی چھپ چکی تھی جس میں ان کے بعض مضامین اور خطبات شامل ہیں۔ ان میں بہت قدیم بھی ہیں اور ۱۹۲۲ء میں لکھے گئے مقالے بھی ہیں۔ ان مقالوں میں سید سلیمان ندوی نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اردو سندھ میں بنی ہے چنانچہ لکھتے ہیں کہ:۔ "قرین قیاس یہی ہے کہ جس کو آج ہم اردو کہتے ہیں اس کا ہیولیٰ وادی سندھ میں تیار ہوا ہوگا۔" اس سے پہلے بھی ایک خطبے میں انہوں نے کہا ہے۔

"اردو زبان کا پیدا ہونا کسی ایک قوم یا کسی ایک طاقت کا کام نہیں ہے۔ بلکہ مختلف قوموں اور زبانوں کے میل جول کا ایک ناگزیر اور لازمی نتیجہ ہے۔۔۔۔۔ اردو شاہجہان کے عہد ہی کے زمانہ کی یادگار بتائی جاتی ہے۔ لیکن اصل یہ ہے کہ غوریوں، خلجیوں اور تغلقوں ہی کے زمانے میں یہ پیدا ہو چکی تھی۔ یہ مخلوط زبان سندھ، گجرات، اودھ، دکن، پنجاب اور بنگال۔ ہر جگہ کی صوبہ وار زبانوں سے مل کر ہر صوبہ میں الگ الگ پیدا ہوئی۔"

حیرانی کی بات یہ ہے کہ سید سلیمان ندوی کے یہ مضامین محمود شیرانی کی کتاب پنجاب میں اردو کی اشاعت کے بعد چھپے ہیں۔ محمود شیرانی نے اپنی کتاب میں بڑی ٹھوس دلیلیں دی ہیں اور پنجاب میں اردو کے مآخذ کو ایسی شہادتوں اور ثبوت سے پیش کیا ہے کہ کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ سید سلیمان ندوی سے معلوم ہوتا ہے کہ حافظ شیرانی کی کتاب کو پڑھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔ سلیمان ندوی کے سارے بیانات اردو زبان کے مآخذ کے بارے میں بڑے متضاد ہیں اور وہ خود بھی ذہنی طور پر صاف نہیں ہیں۔ چنانچہ ان کے بعد جب پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی نے اس موضوع پر قلم اٹھایا تو وہ سلیمان ندوی سے بھی گمراہی میں دو قدم آگے نکل گئے اور عجیب و غریب بھول بھلیوں میں الجھتے چلے گئے۔ چونکہ ان دونوں اصحاب کا دائرہ شعر اور تنقید ہے اور لسانیات کے ماہر ہونے کا انہوں نے کبھی دعویٰ بھی نہیں کیا۔ اس لیے یہ اپنی وسعت نظر کے باوجود اصل مسئلے سے دور ہٹ گئے ہیں۔

ان دونوں حضرات کے مقالات کی اشاعت کے بعد یہ بحث ایک بار پھر

چھوڑ گئی کہ اردو زبان کی اصل کونسا علاقہ ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اردو کے پنجاب میں پیدا ہونے کے مسلّم الثبوت نظریے کو پس پشت پھینکنے کا رجحان شروع ہو گیا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ ہمارے خیال میں یہ تھی کہ اس رجحان کو ہوا دینے والے اردو اور ہندی کے ادیب چونکہ خود لسانیات پر کافی عبور نہیں رکھتے تھے اس لیے خود ذاتی تحقیق کرنے سے اگر رہے۔

دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ ان میں سے اکثر صوبہ داری عصبیت کا شکار ہو گئے اور اترپردیش دہلی کے سوا کسی اور مقام کو اردو اور ہندی کا مرکز اور مُولِد ماننے پر تیار نہیں ہوئے۔ وہ نہیں گوارا کرتے تھے کہ برج کی مقدس سرزمین اردو کے مُولِد ہونے کے اعزاز سے محروم ہو جائے اور اردو کے مُولِد ہونے کا تاج پنجاب کے سر پہ رکھا جائے۔ ڈاکٹر مسعود حسین نے اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالے 'تاریخ زبان اردو' میں اس امر کی کوشش کی ہے کہ پنجابی سے توجہ ہٹا کر ہریانوی زبان کو آگے بڑھایا جائے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خان یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ۔

> "یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ ہندوستان کی جدید آریائی زبانوں کے طلوع کے وقت ہریانی اور پنجابی میں خطِ فاصل قائم کرنا دشوار تھا۔"

لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ عجیب و غریب خیال بھی ظاہر کرتے ہیں کہ۔

> "البتہ شور سینی اپ بھرنش کی جانشین ہونے کی حیثیت سے پنجابی زبان کے مقابلے میں ہریانی اور کھڑی بولی کو زیادہ قدیم ماننا پڑے گا۔"

ڈاکٹر مسعود حسین خاں کی اس کتاب کے بارے میں ڈاکٹر محی الدین زور اپنے ایک مقالے میں لکھتے ہیں۔

> "اس کتاب میں ڈاکٹر مسعود صاحب سے ایک اہم فروگذاشت یہ ہوئی ہے کہ انہوں نے موجودہ پنجابی اور موجودہ ہریانی کا مقابلہ قدیم دکنی سے کر کے نتائج اخذ کئے ہیں۔ حالانکہ دکنی اردو نے جس وقت پنجاب میں نشوونما پایا اس وقت ہریانی اور کھڑی بولی تو کجا برج بھاشا بھی ایک جداگانہ زبان کی حیثیت سے ابھی عالم وجود میں نہیں آئی تھی اور خود انہوں نے پروفیسر شیرانی کے اس نظریے کو قبول کیا ہے کہ ہریانی کی پیدائش مسلمانوں کی آمد دہلی کے بعد عمل میں آئی ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین مانتے ہیں کہ لاہور کی ترکی ہندی فضا میں خواجہ مسعود سعد سلمان پرورش پاتے ہیں جو ہندی زبان کے بھی شاعر تھے اور یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ سعد سلمان کسی ہندوی زبان میں بھی شاعری کرتے تھے اور شاید ان کا دیوان خسرو کے وقت تک دستیاب تھا۔ لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہندوی زبان کون سی تھی۔ اس پہ قیاس قائم کرتے ہیں کہ زبان لاہوری ہو گی۔ یہ ایک عجیب قیاس ہے جب کہ ہم کو معلوم ہے کہ امیر خسروؒ ہر جگہ کی زبانوں کا فرق جانتے تھے اور اپنے عہد کے بہت بڑے ماہر لسانیات محقق تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے عہد کی ہندوستانی زبانوں کی فہرست بھی مرتب کی تھی۔ جس کو مسعود صاحب نے بھی اپنی کتاب میں نقل کیا ہے ایسی صورت میں اگر مسعود سعد سلمان کی زبان لاہوری ہوتی تو امیر خسرو اس زبان کو لاہوری ہی لکھتے اور ان کی زبان اور سعد سلمان کے دیوان کی زبان میں فرق ہوتا تو وہ ضرور یہ بھی واضح کر دیتے کہ میں نے تو دہلوی میں شاعری کی اور سعد سلمان نے لاہوری زبان میں شاعری کی۔ لیکن اس کی بجائے انہوں نے اپنی اور مسعود دونوں کی زبان کا نام ہندوی ہی لکھا۔ اس سلسلے میں ایک اور بات بھی واضح کر دینا ضروری ہے کہ امیر خسروؒ نے اپنی زبانوں کی فہرست سے ہندوی زبان کو الگ ہی رکھا ہے۔ اس لیے کہ یہ زبان صوبجاتی زبان اختیار کر چکی تھی۔ ان کے عہد میں یہ کوئی مقامی زبان نہیں رہی تھی اور انہوں نے جن زبانوں کے نام لکھے ہیں وہ صرف مقامی ہیں اور ان مقامی زبانوں کی فہرست میں انہوں نے برج بھاشا کو دہلوی اور پنجابی کو لاہوری زبان لکھا ہے۔ مسعود خاں دہلوی کو اردو سمجھتے ہیں۔ اگر یہ درست ہوتا تو خسروؒ پہ یہ الزام رہتا کہ انہوں نے برج بھاشا ایسی زبان کا ذکر ہی نہیں کیا۔ قصہ مختصر یہ کہ ہریانی کو اردو کا ماخذ ثابت کرنے کی کوشش میں ڈاکٹر مسعود حسین کی پوری کتاب ایک گنجلک اور متضاد بیانات کا مجموعہ بن کر رہ گئی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ کتاب بڑی محنت اور کاوش سے لکھی گئی ہے اور مصنف نے لسانی مسائل سے گہرے شغف کا ثبوت دیا ہے لیکن محض جیوز بلاک کی سند پہ ایک پورا نظریہ قائم کرنے اور پنجاب میں آغاز اردو کے نظریے کو غلط ثابت کرنے کی سعی میں اپنی ساری قابلیت وقف کر دی ہے۔ قدیم دکنی اردو کی بہت سی کتابیں اس اثنا میں شائع ہو کر منظر عام پہ آ چکی ہیں اور آ رہی ہیں۔ ان میں سے بعض ایسی ہیں جن تک حافظ شیرانی اور ڈاکٹر مسعود حسین کی بھی رسائی نہیں ہوئی۔ دکن کی طرح گجرات، مالوہ اور خاندیس کے قدیم مصنفین کی کتابوں اور نظموں کی زبان بھی اس مقابلہ اور موازنہ میں زیر بحث آنا ضروری ہے۔ اس لیے کہ ان علاقوں میں بھی سرزمین پنجاب ہی کے فیض یافتہ صدیوں، سیاسی اور علمی حیثیت سے برسراقتدار رہے ہیں۔ حقیقت میں اردو، ہندی اور پنجابی ۔ تینوں زبانیں باہم دگر پیوست ہیں اور سرزمین پنجاب نے ہندی اور اردو کی شکل میں ہندوستان اور پاکستان کو عظیم الشان نعمتیں عطا کی ہیں۔"

اردو پنجابی ۔ ڈاکٹر محی الدین زور

اُردو زبان پر دیو مالا کا اثر

مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد سے پہلے یہاں کئی ایک مذہب یا مت رائج تھے ہندوستان چونکہ ایک وسیع ملک تھا۔ اس لیے یہاں ہر صوبے اور ہر علاقے میں اپنے اپنے عقائد پہ لوگ زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان میں ان لوگوں کے عقائد بھی شامل تھے جو جنگلوں میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ جے ای کارپنٹر نے اپنی کتاب میں ہندوستان کے قدیم مذاہب کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ چونکہ ہندو مذہب کا کوئی ایک شخص بانی نہیں تھا اس لیے اس قوم کے عقائد میں بھی بہت فرق رہا ہے۔ مقامی رنگ قبول کرتے ہوئے نئے نئے دیوتاؤں نے جنم لیا۔ ساتویں صدی عیسوی میں ہندوستان میں تین دھرم یا مذہب خاص طور پر نمایاں تھے (۱) ہندو مت (۲) جین مت (۳) بدھ مت۔ یہی وہ وقت تھا جب مسلمانوں نے ظہور اسلام کے بعد اس خطہ زمین میں قدم رکھا اور اپنے طرز تمدن معاشرت اور تہذیب کی روایات کی بنیاد رکھی۔

ہندومت

ول ڈیوراں نے اپنی کتاب "دی سٹوری آف سولائزیشن" کے پہلے حصے میں ہندوستان کے بارے میں لکھتے ہوئے کہا ہے کہ ہندومت ایک ایسا مذہب ہے جس میں ان گنت دیوی دیوتاؤں کو خدا کی صفات کے طور پر پوجا جاتا ہے۔ ہندومت کی پرانی کتابیں بھی اس امر کی نشاندہی کرتی ہیں کہ بھگوان ایک اعلیٰ اور ارفع ہستی کا مالک ہے اور اس کی صفات بھی ہیں۔ اگر بھگوان کی کوئی خاص شکل وشباہت نہیں ہے۔ پھر بھی اس میں اتنی شکتی اور طاقت ہے کہ وہ جس روپ یا شکل میں چاہے اپنے آپ کو رونما کر لیتا ہے۔ ہندومت میں ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو بھگوان کی ان تمام صفات کو ایک جگہ اکٹھا کر کے اس کی پوجا کرتا ہے۔ کچھ طبقے ایسے ہیں جو بھگوان کی الگ الگ صفات کی پوجا اس کے مختلف بت بنا کر کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ بھگوان کے جلوے اور روپ بے شمار ہیں۔ اس لیے ان کی پوجا الگ الگ صفت کا الگ الگ بت بنا کر ہی ہو سکتی ہے۔ بھگوان کی ساری صفات کو ایک ہی روپ میں پیش کرنا بہت مشکل ہے۔ اس طبقے کے عقیدے کے مطابق بھگوان کی جملہ صفات کی پرستش دراصل ایک ہی بھگوان کی پوجا کرنے کے مترادف ہے۔ ول ڈیوراں اسی امر پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

> "ہندومت کسی ایک خاص طرز فکر کا نتیجہ نہیں ہے نہ ہی کوئی ایک شخص ایسا ہے جس نے اس مذہب کو ایجاد کیا ہو۔ یہ مذہب ہندوستان کے مختلف مذاہب اور عقیدوں کا ایک جگہ ملاپ ہے۔ مجموعی حیثیت سے کئی ایک مذہبوں کا ایک مجموعا اضداد ہے جس میں بے شمار فرقے بن گئے ہیں ہندومت کے عقیدے اختصار کے ساتھ بیان نہیں کیے جا سکتے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اس مذہب کے تمام فرقوں کا مطالعہ کیا جائے۔"

شیومت

اس مذہب کی تاریخ بھی بہت پرانی ہے۔ اس مذہب کے بانی کا کچھ پتا نہیں چل سکا۔ دوسری صدی قبل مسیح میں پاتانجلی نے اس فرقے کی ریاضت اور عبادات کے طریقے رائج کیے۔ کچھ اصول بنائے۔ یونانی فلاسفر اور ماہر لسانیات میگس تھینز نے لکھا ہے کہ اس فرقے کے لوگ شیو کی پوجا کرتے ہیں۔ شیو کی پوجا کا ذکر حضرت مسیح علیہ السلام کی پیدائش سے چھ سو سال پہلے بھی اپنشدوں میں برابر ملتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ مذہب ہندوستان کا سب سے قدیم اور پرانا مذہب کہا جاتا ہے۔ اس فرقے کے لوگ شیو دیوتا کو دوسرے تمام دیوتاؤں سے افضل اور برتر سمجھتے ہیں۔ شیو دیوتا کا تصور ان کے ہاں بالکل شخصی اعتبار پر قائم ہے۔ مثلاً جو کمزوریاں ایک عام انسان میں پائی جا سکتی ہیں ان کے پائے جانے کا امکان شیو دیوتا میں بھی ہے۔ دیوتا بھی عام انسانوں کی طرح جذبات کے غلبے میں آجاتے ہیں اور غلطی کر سکتے ہیں۔

جیسے اے سی پینٹر نے لکھا ہے کہ۔ "یہ فرقہ خدا کی وحدانیت کا قائل ہے۔ لیکن اس طرح نہیں جس طرح سے کہ ایک مسلمان کو توحید کا درس دیا جاتا ہے۔ شیومت کے ماننے والے یہ سمجھتے ہیں کہ شیو کے وجود میں کئی ایک وجود شامل ہیں۔ وہ ایک نہیں بلکہ تین ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں بھی آپ کو شیو کا بت نظر آئے گا اس کے تین مونہہ ہوں گے۔ اسے سنسکرت میں تری مورتی کہا جاتا ہے۔ آج بھی ہندوستان میں اس مورتی کو بڑی مذہبی حیثیت حاصل ہے یہ لوگ شیو دیوتا کے تین روپ اس طرح سے خیال کرتے ہیں (۱) زندگی (۲) روح (۳) مادہ۔ یہاں ان کے اندر تضاد کی بنیاد دکھی جاتی ہے۔ کیونکہ ایک طرف تو اس فرقے کے لوگ خدا کی وحدانیت کے قائل تو ہیں لیکن دوسری جانب وہ شیو دیوتا کے تین روپ بھی تسلیم کرتے ہیں۔

شیومت کے ماننے والوں کے نزدیک بھگوان کو دنیا کی ہر شے پر اختیار ہے وہ بڑی محبت کرنے والا مہرباں ہے۔ وہ پانچ باتیں کرتا ہے (۱) پیدا کرنا (۲) چھپانا (۳) قائم رکھنا (۴) مہربانی کرنا اور پانچواں ختم کر دینا۔ اپنی نجات کے لیے شیومت کے ماننے والے مختلف طریقوں سے عبادت کرتے ہیں۔ یہ نفس کشی بھی کرتے ہیں۔ ان کے فرقے میں بھی جین مت والوں کی طرح کسی جاندار کو مارنا بہت بڑا گناہ ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اپنے جسم کو مارنے سے روح پاکیزہ اور گناہوں سے پاک ہو جاتی ہے۔ وہ یہ بھی مانتے ہیں کہ روح کے اندر اپنے برے عملوں کی وجہ سے جو غلاظت اور کثافت آجاتی ہے اس کو نفس کشی اور ریاضت کی وجہ سے دور کیا جا سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ شیومت کے ماننے والے یوگ سسٹم پر بہت زیادہ اعتقاد رکھتے ہیں۔ وہ جسم کو مختلف طریقوں سے تکالیف دے کر روح کو آلودگیوں سے پاک کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ آخر میں نفس کشی اور ریاضت کے بعد بھگت کی روح شیو کی روح میں جا کر مل جاتی ہے اور اس کی مکتی ہو جاتی ہے۔

وشنومت

وشنومت بنیادی طور پر قدیم ویدوں سے بہت متاثر ہے اس عقیدے کے لوگ شیو کی بجائے وشنو کو سارے خداؤں کا خدا تسلیم کرتے ہیں۔ وہ شیو کو بھی وشنو کا ایک روپ اور اوتار کہتے ہیں۔ وہ شیو کو بذات خود خدا تسلیم نہیں کرتے۔ وشنو کا ذکر ہمیں پرانے رگ وید میں ملتا ہے لیکن اس عہد میں وشنو کو اتنی اہمیت نہیں دی گئی تھی بعد کے زمانے میں وشنومت پورے شمالی ہندوستان اور جنوبی ہندوستان کے کچھ حصے میں پھیل گیا۔ وشنومت دکن سے نکل کر جب جنوبی ہند کے علاقے میں پہنچا تو تامل زبان نے اسے اپنے اندر جذب کر لیا۔ آج بھی تامل اور تلیگو زبانوں میں وشنو کے ان گنت بھجن اور اشلوک ہیں۔ تامل کی سرزمین میں وشنومت کو ایک طرح سے شاہی سرپرستی بھی حاصل رہی۔ الوار قوم کے راجاؤں اور علما نے اس مت کو بہت عروج دیا۔ ان لوگوں کی خدمات کی وجہ سے وشنومت نے دیکھتے دیکھتے بے پناہ عروج حاصل کر لیا۔

الواروں کی تحریک جنوبی ہند کی اس زمانے میں ایک بہت بڑی فکری تحریک تھی۔ یہ لوگ مابعد الطبیعاتی بہت کم تھے۔ یہ لوگ وشنومت کے بڑے جذباتی حد تک گرویدہ تھے۔ یہ لوگ عشق و محبت کے بھی قائل تھے۔ چنانچہ انہوں نے ساری جنوبی ہند کی دیومالا کو وشنومت میں شامل کر دیا اور خود سارے عشق و محبت کے دیوتاؤں اور دیویوں کی پرستش شروع کر دی۔ یہ لوگ وشنومت میں بہت آگے نکل گئے۔ انہوں نے مبالغے کی حد تک اس مت کو آسمان پر پہنچا دیا۔ ان کے نزدیک وشنو کی حیثیت غیر فانی اور لازوال ہے۔ وشنو شروع سے ہے اور ابدالآباد تک رہے گا وہ غیر متناہی ہے۔ وہ ہر جگہ ہے۔ وہ صرف محبت کرتا ہے۔ وہ پرورش کرتا ہے۔ وہ تباہی نہیں لاتا جس طرح کہ شیو لاتا ہے۔ وہ ہر شے پر حاوی ہے۔ وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ وہ لوگوں کی ایک ایک بات پر نظر رکھتا ہے۔ وہ خود بہت عظیم ہے اور اکیلا ہے۔ لیکن اپنی خوشی اور اپنی نمود کے لیے وہ کئی دیوتاؤں اور اوتاروں کی شکل میں بھی اس دنیا میں ظاہر ہو سکتا ہے اور ہوتا رہا ہے۔ وشنو ایک اعتبار سے انسانوں کے لیے وہی حیثیت رکھتا ہے جو ماں باپ کی حیثیت ہے۔ وہ ہر ایک کے ساتھ مہر و محبت کے ساتھ

پیش آتا ہے اور پھر بھی اس کی محبت کا خزانہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔

وشنو کی ایک اپنی آتما ہے۔ اس آتما کو پرانے گیانیوں نے ایک خاص حالت کا نام دیا ہے۔ یہ روح۔ یہ حالت اور کیفیت اسی ایک خدا کا حصّہ ہے جو ہماری کائنات کا مالک ہے۔ یہ لوگ بھی روح کو مادے سے ایک الگ شے مانتے ہیں۔ مادہ ان کے نزدیک تبدیل ہوتا رہتا ہے لیکن روح اپنی جگہ پہ قائم و دائم رہتی ہے۔ وہ تبدیل نہیں ہوتی۔ وشنومت کے ماننے والے اس بات کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ بھگوان نے انسان کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ اس کی عبادت کرے۔ اس عبادت میں اگر محبت کا جذبہ نہیں ہے تو پھر یہ بیکار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وشنومت میں محبت کو بڑی زبردست اہمیت حاصل ہے۔ محبت خواہ میاں بیوی کی آپس میں ہو۔ بہن بھائی کی ہو۔ دو سہیلیوں کی ہو۔ دو دوستوں کی ہو یا ماں باپ کی اپنی اولاد سے ہو۔

جے اے کارپنٹر نے اپنی کتاب "ہندوستان کا سماجی ورثہ" میں ایک نمائندہ وشنومت کے پجاری کی عکاسی اس کے اپنے الفاظ میں یوں کی ہے کہ میں وشنومت کو خدا کا روپ مانتا ہوں۔ وہ میرا باپ ہے۔ وہ میری ماں ہے۔ وہ میرا گرو ہے۔ وہ مجھے کھانے کو دیتا ہے۔ وہ میری پرورش کرتا ہے۔ وہ مجھے رات کو سلاتا ہے اور صبح بیدار کرتا ہے۔ میں محبت کے واسطے سے ہی خدا کو پا سکتا ہوں۔ اگر محبت نہیں تو میں ساری عمر بھٹکتا رہوں گا۔ محبت ہی وشنو کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ محبت ہی میرا اوڑھنا بچھونا ہے۔ مجھے وشنو کی خدمت کسی انعام کے لالچ میں نہیں کرنی چاہیئے مجھے وشنو کی خدمت صرف وشنو کے لیے ہی کرنی چاہیے۔ اس کی مرضی، اس کی رضا حاصل کرنے کے لیے کرنی چاہیے۔ مجھے کوئی ضرورت نہیں کہ میں مکتی حاصل کرنے کے لیے اس دنیا کو چھوڑتا پھروں۔ اگر اس دنیا میں رہتے ہوئے بھی، اس دنیا کے فرض ادا کرتے ہوئے مکتی مل سکتی ہے تو پھر دنیا کو چھوڑنے کی بھلا کیا ضرورت ہے؟"

وشنومت کا سب سے بڑا مبلغ اور گرو رام نج تھا۔ یہ شخص ۱۰۱۷ء میں جنوبی ہندوستان کے ایک گاؤں میں پیدا ہوا۔ رام نج بہت زیرک، عالم اور عقلمند شخص تھا اس نے وشنومت کو اختیار کیا کر اپنی ساری زندگی اس مذہب کی تبلیغ کے لیے وقف کر دی۔ اس نے اس مذہب میں بعض نظریاتی تبدیلیاں بھی کیں۔ مثلاً وشنومت میں یہ عام نظریہ رائج تھا کہ برہم ہی سب کچھ ہے اور اس کے علاوہ ہیں جو چیز بھی دکھائی یا سنائی دیتی ہے وہ محض فریب ہے۔ جھوٹ ہے۔ مایا ہے۔ رام نج نے کہا کہ برہم کے علاوہ دوسری چیزیں مایا یا فریب نہیں ہیں۔ ان کی اس دنیا میں ایک اپنی حیثیت ہے اور وہ اپنی اپنی جگہ پہ بڑی خوش اسلوبی اور ذمہ داری سے اپنا اپنا کردار انجام دے رہی ہیں۔

رام نج کے بعد اگر اس مذہب کو کہیں فروغ حاصل ہوا تو وہ بنگال کا شمالی علاقہ تھا۔ اس علاقے کے لوگوں نے وشنومت کو فراخ دلی سے قبول کیا اور سب سے بڑا ظلم اس مذہب پر یہ کیا کہ اس میں بڑا ہی انفعالی قسم کا تصوف لا کر اس میں داخل کر دیا۔ وشنومت کے رام نج نے دنیا کو تیاگ دینے اور چھوڑنے کی سختی سے مخالفت کی تھی۔ یہ ایک باعمل فلسفہ تھا۔ لیکن بنگال میں جاتے ہی وہاں کے لوگوں نے اس مذہب کو ایک ایسا فلسفہ دیا جو بے عمل سا فلسفہ تھا اور جس میں مکتی کے لیے اس دنیا کو چھوڑ دینا ایک اہم شرط تھی۔ یہ لوگ وشنو کی پوجا میں منہمک ہو کر رفتہ رفتہ اپنے برہم یعنی خدا سے ملاپ چاہتے تھے۔ ان لوگوں نے بھگوان اور اس کے بندے کا رشتہ اس طرح سے بنا دیا جیسے ایک میاں اور بیوی کا رشتہ ہوتا ہے۔ یعنی ایک انسان کو بیوی کی بنا دیا اور بھگوان کو اس کا شوہر بنا کر پیش کر دیا۔ جبکہ اس عہد سے پہلے ویدوں میں بھی یہ بھگوان اور بندے کے درمیان باپ اور بیٹے کا رشتہ سمجھا جاتا تھا۔

وشنومت کے بھی دو مشہور فرقے ہیں۔ ایک فرقہ تو خدا کی وحدانیت کا قائل ہے اور دوسرا فرقہ خدا کی کئی صفات کو دیوتا بنا کر پوجا کرنے کا قائل ہے۔ شیومت کے ماننے والوں کی طرح یہ بھی وشنو کے تین روپ پہ ایمان رکھتے ہیں۔ یعنی زندگی۔ روح اور مادہ۔

بدھ مت

اردو کی ابتدائی تاریخ کو بیان کرتے ہوئے ہم ایک جگہ بیان کر چکے ہیں کہ بدھ مت کے عروج کے زمانے میں شمالی ہند کے ایک خاص علاقے یعنی ہمالیہ کی ترائی میں جو زبان بولی جاتی تھی وہ پالی زبان تھی اور گوتم بدھ بھی اسی زبان میں گفتگو کیا کرتا تھا۔ پالی زبان بھی بعد میں برج بھاشا میں آ کر گم ہو گئی اور یوں اس زبان نے بھی دوسری زبانوں اور بولیوں کی طرح اردو زبان کی بڑی خدمت کی۔ اب ہم مختصراً بدھ مت کا جائزہ پیش کرتے ہیں۔

بدھ مت کا بانی کپل وستو کی ریاست کا شہزادہ گوتم بدھ تھا۔ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے ۵۶۸ برس پہلے کپل وستو میں اپنے راجہ باپ سدھودھن کے ہاں پیدا ہوا۔ وہ اکلوتا راجکمار تھا۔ باپ نے اس کے پیدا ہونے پہ بہت زبردست خوشی منائی۔ سارے محل کو چراغاں کیا گیا۔ لیکن جب نجومی نے راجہ کو بتایا کہ یہ راجکمار بڑا ہو کر فقیر بن جائے گا تو راجہ کی ساری خوشیوں پر اوس پڑ گئی۔ اس نے نجومی سے پوچھا کہ اس کا کوئی سدباب نہیں ہو سکتا؟ شاہی نجومی نے بتایا کہ اس شہزادے کو زیادہ سے زیادہ محل کے اندر رکھا جائے تاکہ اس کی نگاہ کسی بوڑھے، کسی بیمار اور کسی مرے ہوئے شخص کے چہرے یا اس کے جنازے پر نہ پڑے۔ راجہ نے اس مقصد کے لیے محل کے اندر ایک اور شاندار محل تعمیر کرایا جس میں عیش و عشرت کا سارا سامان مہیا کر دیا۔ راجکمار سدھارتھ اس محل میں پرورش پاتا ہوا جوانی کی عمر کو پہنچ گیا۔ کہتے ہیں اس بات کا خاص اہتمام کیا گیا تھا کہ سدھارتھ کے محل میں رہنے والی دیوداسیوں میں سے کوئی بھی دیوداسی ذرا بوڑھی یا بیمار نظر آتی تو فوراً اس کی جگہ جوان دیوداسی منتقل کر دی جاتی۔ کسی خادم یا خادمہ کو اس بات کی اجازت نہیں تھی کہ وہ گوتم کے سامنے کسی بیماری یا موت کا یا بڑھاپے کا ذکر کرے۔ گوتم کو محسوس ہی نہیں ہوا تھا کہ دنیا میں کوئی بیماری بھی ہے۔ بڑھاپا بھی ہے اور موت بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب زندگی میں پہلی بار اس نے ایک بوڑھے آدمی کو اور ایک لاش کو جلتے دیکھا تو دنگ رہ گیا۔

شادی آخر ہو کر رہی۔ ایک روز گوتم نے محل میں قید کی زندگی بسر کرتے کرتے تنگ آ کر راجہ سے کہا وہ اپنی راجدھانی کی سیر کرنا چاہتا ہے۔ راجہ نے اپنے نجومی سے مشورہ کیا۔ نجومی نے کہا شہزادے کو روکنا ٹھیک نہیں۔ وہ جوان ہو گیا ہے۔ اگر روکا گیا تو وہ اپنے طور پر سڑکوں پر نکل جائے گا۔ بہتر یہی ہے کہ اسے شاہی رتھ میں شہر کی سیر کی اجازت دے دی جائے۔ لیکن اس بات کا خاص طور پر انتظام کیا جائے کہ اس روز شہر کی سڑکوں پہ کوئی بوڑھا، کوئی بیمار، کوئی جنازہ نظر نہ آئے۔

ایسا ہی ہوا۔ خفیہ طور پر سارے شہر کے بوڑھوں اور بیماروں کو اطلاع کر دی گئی۔ کہ وہ اس روز ہرگز ہرگز اپنے گھر سے باہر قدم نہ رکھیں۔ پنڈتوں کو یہ بھی کہہ دیا گیا کہ وہ کسی بھی جنازے کو لے کر شہر کی سڑکوں پر سے نہ گزریں۔ چنانچہ وہ گھڑی آ گئی جب شہزادہ گوتم اپنے ساتھی چنا کی معیت میں شاہی رتھ پر سوار ہو کر شاہی محل سے راجدھانی کی سیر کو نکلا۔

سارے شہر کی سڑکوں کو رنگ برنگ جھنڈیوں اور پھولوں کے ہاروں سے سجایا گیا تھا۔ ہر طرف جوان اور صحت مند چہرے ہی نظر آ رہے تھے۔ گوتم بڑا خوش خوش اپنی رعایا کے سلام کا جواب دیتا شاہی رتھ پر گزر رہا تھا اور پھر ایسا ہوا کہ اچانک ایک بوڑھا کھانستا ہوا اس کے سامنے آ گیا۔ وہ ہڈیوں کا پنجر تھا اور بیماری نے اس کے جسم کو چاٹ کر رکھ دیا تھا۔ وہ مرنے والا تھا۔ گوتم نے اسے دیکھ کر رتھ روک لیا اور حیرانی سے پوچھا۔

"یہ کون ہے؟"

اس کے ساتھی رتھبان نے کہا۔ "میرے مالک یہ ایک بوڑھا شخص ہے۔ موت اس کے دروازے پر دستک دے رہی ہے"۔ شہزادے گوتم نے پوچھا۔ "موت کیا ہے؟" رتھبان نے کہا۔ "جو آدمی بولتے بولتے چپ ہو جاتا ہے۔ پھر نہ وہ ہلتا ہے نہ جلتا ہے۔ لوگ اسے اٹھا کر مرگھٹ میں لے جاتے ہیں اور اسے آگ کے شعلوں پر رکھ کر جلا دیا جاتا ہے"۔ شہزادے نے پوچھا۔ "کیا میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوگا۔ کیا میں بھی اسی طرح بوڑھا ہو جاؤں گا؟" رتھبان نے کہا۔ "ہاں میرے شہزادے!" گوتم نے پوچھا۔ "کیا میری پیاری بیوی یشودھرا کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوگا؟ کیا وہ بھی ایک دن بوڑھی ہو جائے گی اور نقاہت سے زمین پر گر پڑے گی؟" رتھبان نے کہا۔ "ہاں میرے شہزادے! اگر وہ اس عمر تک زندہ رہی تو اس کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوگا"۔ گوتم نے کہا۔

"رتھ واپس محل میں لے چلو چنا! میں نے جو دیکھنا تھا دیکھ لیا ہے"۔

رتھبان شہزادے کو لے کر محل میں واپس آ گیا۔ شہزادہ اداس ہو کر گہری سوچ میں گم ہو گیا اس نے اپنے محل کے سارے گانے والوں کو باہر نکال دیا۔ جب اس کی خبر راجہ کو ہوئی تو اس نے نجومی سے پھر مشورہ کیا۔ نجومی نے کہا۔ اے راجہ! جب شہزادے کے ہاں بچہ پیدا ہوگا تو وہ خود بخود ٹھیک ہو جائے گا"۔ چنانچہ ایک روز شہزادے کے ہاں بیٹا پیدا ہو گیا۔ مگر گوتم کی اداسی دور نہ ہوئی۔ وہ ہر وقت اس سوچ میں گم رہتا کہ یہ دنیا کیا ہے۔ اس دنیا میں غم اور دکھ کیوں ہیں؟ ایک انسان بیمار ہو کر بوڑھا ہو کر مر کیوں جاتا ہے؟ اس کی نیک دل بیوی یشودھرا نے شہزادے کے دل کو بہلانے کی بہت کوشش کی مگر ہونی کے آگے کوئی کیا کر سکتا تھا۔ شدنی نے آخر ہو کر رہنا تھا۔

چنانچہ آخر وہ رات آ گئی۔ شہزادہ گوتم آنکھیں بند کیے ریشمی بستر پر لیٹا تھا وہ جاگ رہا تھا۔ پاس ہی اس کی بیوی اور بچہ سو رہے تھے۔ محل میں شمع دھیمی دھیمی جل رہی تھی۔ فضا میں خوشبوئیں بسی ہوئی تھیں۔ گوتم بدھ نے اچانک آنکھیں کھول دیں۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اسے آواز دی ہو۔

"شہزادے! اٹھو تمہارا وقت آ گیا ہے۔ تمہیں لوگوں کی بھلائی کے لیے اس محل کے عیش و آرام کو چھوڑ دینا ہے۔ تمہیں خود جنگلوں میں بھٹک کر لوگوں کو آرام پہنچانے کے بارے میں غور کرنا ہے۔ تمہیں یہ غور کرنا ہے کہ انسان دکھی کیوں ہے؟ وہ کیوں بیمار ہے؟ وہ کیوں پریشان ہے؟ تمہیں انسانوں، جانوروں، چرند پرند کے دکھوں کے علاج کے لیے محل کو چھوڑ کر ننگے پاؤں جنگلوں میں گھومنا ہے۔ اٹھو! وقت آ گیا ہے۔ وقت آ گیا ہے"۔

گوتم بدھ آہستہ سے اٹھا اس نے اپنی بیوی اور بچے کے معصوم چہرے کو دیکھا۔ وہ بڑے سکون سے دنیا و مافیہا سے بے نیاز گہری نیند میں سو رہے تھے۔ گوتم اٹھ کر خواب گاہ سے باہر نکلنے لگا تو اسے یوں لگا جیسے کسی نے اس کے پاؤں جکڑ دیئے ہوں وہ رک گیا۔ پلٹ کر اس نے اپنے بچے کو دیکھا۔ وہ معصومیت کا پیکر سکون سے محو خواب تھا۔ اس کا دل بچے کو پیار کرنے کو تڑپ اٹھا۔ لیکن محض اس خیال سے اس نے پیار نہ کیا کہ کہیں وہ جاگ نہ پڑے اور اس کی محبت اسے روک نہ لے۔ اس نے ماں بیٹے پر ایک آخری نگاہ ڈالی اور خواب گاہ سے باہر نکل گیا۔ یہاں باری علیگ نے اپنی کتاب "تاریخ کا مطالعہ" میں ایک جملہ لکھا ہے۔

"گوتم اس محل کو ہنسی خوشی چھوڑ رہا ہے جس میں داخل ہونے کی خواہش نے انسانی تاریخ کو خونیں بنا رکھا ہے"۔

شہزادے گوتم نے اپنے رتھبان کو جگایا۔ وہ گھوڑے پر سوار ہوا اور محل کے بڑے دروازے پر آ گیا۔ کہتے ہیں محل کا بڑا دروازہ پیتل کا تھا اور اس کے کھلنے کی آواز پوری راجدھانی میں سنی جاتی تھی۔ لیکن اس رات اس دروازے کی آواز کسی نے نہ سنی۔ سارا شہر سوتا رہا۔ بادشاہ سوتا رہا اور شہزادہ گوتم گھوڑے پر سوار ہو کر شاہی محل سے نکل کر دور جنگل میں پہنچ گیا۔ یہاں اس نے اپنا گھوڑا اور لمبے بال کاٹ کر اپنے خادم کے حوالے کیے اور کہا۔ "میرے راجہ باپ سے کہنا کہ آپ کا بیٹا ہزار گنا زیادہ اچھا شہزادہ بن کر واپس آئے گا"۔ نوکر نے رو کر کہا۔ "شہزادے! آخر نجومیوں کی پیشگوئی آج سچ ثابت ہو کر رہی"۔ گوتم نے کہا۔ "ہونے والی بات کو کوئی نہیں روک سکتا"۔

شہزادہ گوتم دریا پر پہنچ کر رک گیا۔ یہاں اس نے اپنا شاہی لباس ایک غریب ماہی گیر کے لباس سے بدل لیا اور دریا پار کر کے گھنے جنگلوں میں نکل گیا۔ گوتم آٹھ برس تک جنگل جنگل گھومتا پھرتا رہا۔ اس زمانے میں اس کی ملاقات بڑے بڑے عالموں پنڈتوں اور سادھوؤں سے ہوئی جو ریاضت کی انتہائی بلندیوں پر پہنچ چکے تھے۔ گوتم نے اپنے سوالوں کے جواب ہر ایک سے پوچھے۔ مگر کوئی اس کے دل کی تسلی نہ کر سکا۔ وہ شمالی ہند کی بڑی بڑی علمی درس گاہوں میں بھی گیا جہاں پنڈت گیانی طالب علموں کو فلسفہ کا درس دیتے تھے۔ ان سے بھی تبادلہ خیال کر کے گوتم کے دل کی پیاس نہ بجھی۔ آخر وہ ایک بڑ کے درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اس درخت کے نیچے سے اس وقت اٹھے گا جب اسے گیان حاصل ہو جائے گا تاریخ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ گوتم ایک برس تک اس درخت کے نیچے گیان دھیان میں محو رہا۔ آخر اسے گیان مل گیا۔

جب وہ بڑ کے درخت کے نیچے سے اٹھا تو اسے مکتی حاصل ہو گئی تھی۔ اس پر دنیا کے سارے دکھوں اور پریشانیوں کے راز کھل چکے تھے۔ اس نے اب تبلیغ کا کام شروع کر دیا اور لوگوں کو بتایا کہ ان کے دکھوں کا علاج آٹھ اصولوں پر عمل کرنے میں ہے۔ جن میں سے خاص یہ ہیں کہ انسان کو راست فکری، راست گوئی اور راست خیالی سے کام لینا چاہیے۔ وہ جھوٹ نہ بولے۔ چوری نہ کرے۔ کسی کو دکھ نہ دے۔ محبت صرف خدا کی ذات سے کرے اور کائنات کے اصولوں کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ اس نے چھوت چھات کے خلاف بھی زبردست آواز بلند

کی۔ ہندوستان میں یہ آریا برہمنوں کے عروج کا زمانہ تھا۔ ان لوگوں نے سنسکرت کو عالی خاندان کی زبان بنا کر اوپر طاق میں بٹھا رکھا تھا۔ اگر کسی غیر آریائی کے کان میں سنسکرت کے شلوک پڑ جاتے تھے تو اس کے کان میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال دیا جاتا تھا۔

یہ وہ دور تھا جب برج بھاشا، سوراسنی اور دوسری بولیاں، سنسکرت کے تعصب کی وجہ سے اپنے اپنے علاقوں میں خوب رواج پا رہی تھیں، لیکن سنسکرت کے دروازے ان پر بند تھے۔ گوتم بدھ جس زبان میں گفتگو کرتا تھا وہ بھی پالی نام کی ایک مقامی بولی تھی۔ وہ غریب لوگوں کی بول چال میں ہی تبلیغ کرتا تھا۔ اس نے سنسکرت کے دعوے داروں کو چیلنج کیا۔ اس چیلنج میں غریب اور پس ماندہ لوگ اس کے ساتھ تھے جو مقامی بولی بولتے تھے اور جن پر سنسکرت حرام تھی۔ گوتم کی انقلاب انگیز تحریک نے لوگوں کے دلوں پر گہرا اثر کیا۔ فکر و خیال میں تبدیلی ہوئی تو برہمنیت اور برہمنی تعصب کا سنگھاسن ڈولنے لگا۔ سنسکرت زبان کے پرانے محل کے دروازے توڑ دیے گئے اور دوسری بولیاں اس کے ساتھ جا کر کھڑی ہو گئیں۔ سنسکرت کے الفاظ اب برج بھاشا میں بھی آنا شروع ہو گئے۔ بدھ مت نے روز افزوں ترقی شروع کر دی۔ اس کی خوش قسمتی سے اس مذہب کو بڑے بڑے راجاؤں اور مہاراجاؤں کی سرپرستی نصیب ہو گئی تھی۔ اس مذہب میں ذات پات کی بھی کوئی قید نہیں تھی۔ چنانچہ اب امیر غریب لوگ اور امیر غریب زبانیں ایک سطح پر آکر آپس میں گلے مل گئیں۔ ساتویں صدی عیسوی تک ہندوستان میں اور ہندوستان سے باہر بھی اس مذہب کا طوطی بولتا رہا۔ لیکن ساتویں صدی عیسوی کے اختتام پر اس مذہب پر زوال آنا شروع ہو گیا۔

لیکن اس مت نے ذات پات اور امیر و غریب کی تخصیص کو ختم کر کے زبانوں کا آپس میں جو ملاپ کرا دیا تھا۔ اس نے آگے چل کر اردو کی تشکیل میں بڑی نمایاں خدمات سر انجام دیں۔ بدھ مت کے زوال کے بعد ایک بار پھر ہندو مت برسر اقتدار آ گیا۔ مگر جو دروازہ زبان کی بے تعصبی کا کھل چکا تھا وہ دوبارہ بند نہ ہو سکا۔ سنسکرت کے وہ الفاظ جو برج بھاشا اور دوسری زبانوں میں آکر بس گئے تھے وہ واپس نہ لیے جا سکے۔

جین مت

مسز سنکلیر سٹیونسن اپنی کتاب "جین مت کی روح" میں لکھتی ہیں کہ عقیدے کے اعتبار سے جین مت بھی ہندو مت کی ایک شاخ ہے۔ یہ ہندو مذہب کی ایک بیٹی ہے جس کے بے شمار عقیدے اب تک ہندو مت میں رائج ہیں اور کہیں کہیں تو اس کے رہنما بھی برہمن ہی ہیں۔ دوسرے عقیدوں کے علاوہ مسئلہ تناسخ اور اعمال بھی جین مت کے پیروکاروں نے ہندو مذہب ہی سے حاصل کیے ہیں۔ مسز سٹیونسن لکھتی ہیں کہ جین مت نجات کے لیے موت سے نہیں بلکہ زندگی سے چھٹکارا حاصل کرنے کا ایک راستہ ہے، مگر بدھ مت اور ہندو مت کی طرح یہ مت اپنے آپ کو فنا کر دینے یا کسی میں جذب کر دینے میں اپنی مکتی نہیں دیکھتا۔ اس کے الٹ ان کے ہاں نجات کا مقصود یہ ہے کہ ذات، صفات سے اونچی اور بلند ہو کر باقی رہے اور بار بار پیدا ہونے کے سلسلے سے بچ جائے۔ ایک اور محقق نے جین مت کے فلسفہ کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

« جین مت والے اس عقیدے کے مالک ہیں کہ جو ہے اور جو نہیں ہے ان دونوں کے ایک جگہ مل جانے سے کچھ ایسی زبردست طاقتیں پیدا ہو جاتی ہیں جن کی وجہ سے پیدائش، موت اور دوسرے مظاہر زندگی میں ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ مگر یہ سلسلہ روکا بھی جا سکتا ہے۔ جین مت والے کہتے ہیں کہ جو قوتیں جنم لے چکی ہیں انہیں ایک خاص انداز سے ختم بھی کیا جا سکتا ہے اور ان سے نجات بھی حاصل کی جا سکتی ہے۔»

جین مت کے تین بنیادی عقیدے ہیں (۱) صحیح علم (۲) صحیح عقیدہ (۳) صحیح عمل۔ یہ مذہب خدا کی توحید کا بہت کم قائل ہے۔ یعنی روح اور مادے کے الگ الگ ہونے کو تسلیم کرتا ہے۔ اس مت میں مختلف طریقوں سے اپنے جسم کو تکلیف دینے پر زور دیا جاتا ہے تاکہ ترکِ لذات سے مکتی حاصل ہو سکے۔

گراہم مؤرخ کہتا ہے کہ جین مت کی زبان برج بھاشا سے بہت ملتی جلتی تھی جینی مذہب نے اس زمانے کی عام بول چال کی زبان پر بھی گہرا اثر ڈالا۔ اور آگے چل کر اردو کے لیے زمین ہموار کی۔

اردو کی ابتدائی تحریریں

کسی بھی زبان کے بارے میں ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ فلاں دور میں اس کے شجر نے زمین کے اندر سے سر باہر نکالا۔ اور کسی بھی زبان کی ابتدا اور اس کی آفرینش کے بارے میں ہم کوئی خاص تاریخ مقرر نہیں کر سکتے۔ کیونکہ زبان کے نمو کرنے، اس کی بیداری اور اس کے بڑھنے پھولنے کا عمل تاریخ کی جڑوں میں بڑی خاموشی کے ساتھ جاری رہتا ہے۔ اردو کے ساتھ بھی یہ حقیقت صادق آتی ہے۔ اردو زبان بھی دفعتاً پیدا نہیں ہوئی۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے پہلے اس نے مختلف بولیوں سے مل کر زندگی کی نمو کر لی۔ یہ اسی دور میں سنسکرت ایسی دیو قامت زبانوں کو پیچھے چھوڑ کر آگے نکل گئی۔ پھر جب مسلمانوں کی آمد آمد ہوئی تو اس نے بڑی تیزی سے فارسی اور عربی کا اثر قبول کرنا شروع کر دیا۔ ہندوستان میں اسلامی سلطنت کو مغلوں نے قیام دیا۔ اس سے پہلے یہاں چاروں طرف انتشار کی فضا پھیلی ہوئی تھی۔ اس انتشار کی فضا میں بھی اردو زبان کے ارتقا کا عمل برابر جاری رہا اور وہ بڑی جواں ہمتی کے ساتھ بھاشا اور دوسری ہندی زبانوں کے نرغے سے نکل کر اردوئے معلیٰ کی منزل کی طرف بڑھتی چلی گئی۔

اس کے باوجود مغلیہ سلطنت کے قیام سے پہلے ہندوستان میں ہمیں اردو زبان کے مستحکم ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ جیسا کہ پہلے تحریر کیا جا چکا ہے۔ دکن میں اردو بڑی تیزی سے نشو و نما پاتی گئی۔ وہاں شیخ عین الدین، گنج العلم اور خواجہ بندہ نواز گیسو دراز ایسی بزرگ شخصیتوں کے دینی رسالوں سے یہ ثبوت ضرور ملتا ہے کہ دکن میں عہد مغلیہ سے پہلے بھی اردو زبان میں تصنیف و تالیف کا کام ہو رہا تھا۔ اس زمانے میں یہ دکنی بھاشا تھی اور اس میں عربی فارسی کے الفاظ شاعروں کی نظموں وغیرہ میں آنا شروع ہو گئے تھے۔ مثلاً فردوسی کے شاہنامہ میں ہمیں کوتوال کا لفظ ملتا ہے جو کہ خالص ہندی کا لفظ ہے۔ اسی طرح زسی نل کی کتاب ویلاسہ میں عربی اور فارسی کے لفظ ملتے ہیں۔ یہ کتاب منظوم ہے اور ۱۱۵۵ء میں قلمبند کی گئی۔ اس میں کلا (کلاہ) کباۓ (قبا) اور باجا باجا (یعنی بعض بعض) ایسے لفظ آتے ہیں لیکن کوئی مستقل تحریر ہمیں نہیں ملتی۔ نہ کوئی تصنیف ہی دکھائی دیتی ہے۔ پندرھویں صدی عیسوی تک کے زمانے تک یہی فضا قائم رہتی ہے۔ امیر خسرو کے کلام کا زمانہ ۱۲۵۳ء ہے سو ہم امیر خسرو کی پہیلیوں اور انمل اور دو سخنوں کو چودھویں صدی عیسوی کا زمانہ کہہ سکتے ہیں۔ ایک بات بڑی حیرانی کی ہے کہ امیر خسرو کے مطبوعہ کلام میں ان پہیلیوں، انمل اور دو سخنوں وغیرہ کا کچھ پتا نہیں ملتا۔ ڈاکٹر اعجاز حسین کی تحقیق

کے مطابق، ان کے مطبوعہ دیوان میں صرف یہ شعر ملتا ہے۔

؎ اری اری ہم پہ پیاری آئی   ماری ماری برہا کی ماری آئی

یہ شعر ان کی ایک کتاب کے دیباچے میں خود امیر خسرؒو کے ہاتھ کا لکھا ہوا ملتا ہے۔ اگرچہ بقول ڈاکٹر اعجاز حسین حضرت امیر خسرؒو نے خود لکھا ہے کہ میں ہندی زبان میں بھی صاحب دیوان ہوں لیکن ابھی تک ان کا کوئی بھی ہندی کلام دستیاب نہیں ہو سکا۔ دوسری طرف آئیے اگر ہم بھگت کبیر کے ہندی دوہوں کو اردو کا درجہ دے دیں تو پھر ہمیں چودھویں صدی عیسوی میں اگر اردو زبان کا نمونہ ملتا ہے۔ بقول ڈاکٹر اعجاز حسین بھگت کبیر کا کلام بھی ایسا ہے کہ اسے اردو کا درجہ دینے میں کوئی رکاوٹ نظر نہیں آتی بعض مقامات پر تو کبیر نے کچھ ایسے رنگ میں کہا ہے کہ ان کے کلام پر اردو غزل کا شبہ ہونے لگتا ہے۔ مثلاً ایک شعر ملاحظہ ہو۔

؎ ہمن ہے عشق مستانہ، ہمن کو ہوشیاری کیا
رہیں آزاد یہ جگ میں ہمن دنیا سے یاری کیا
جو بچھڑے ہیں پیارے سے بھٹکتے دربدر پھرتے
ہمارا یار ہے ہم میں، ہمن کو انتظاری کیا
خلق سب نام اپنے کو بہت سا سر پٹکتی ہے
ہمن گرنام سانچا ہے، ہمن دنیا سے یاری کیا
نہ پل بچھڑے پیا ہم سے، نہ ہم بچھڑے پیارے سے
ان ہی سے نینہ لاگی ہے ہمن کو بے قراری کیا
کبیرا عشق کا ماتا، دوئی کو دور کر دل سے
جو چلنا راہ نازک ہے، ہمن کو بوجھ بھاری کیا

غزل کی ساری خوبیاں کیا زبان کیا قافیہ اور کیا ردیف۔ ساری کی ساری اس میں موجود ہیں۔ صرف جس رسم الخط میں یہ غزل ملتی ہے وہ رسم الخط دیوناگری ہے۔ عربی یا فارسی نہیں ہے رسم الخط کے معاملے میں تو اردو کی لسانی تاریخ نے بہت بعد میں جا کر عربی اور فارسی کا رنگ اختیار کیا۔ لیکن کبیر کے ساتھ ساتھ تلسی داس کی اس زمانے کی بھاشا کی شاعری میں ہمیں عربی اور فارسی کے الفاظ مثلاً جہاج (جہاز) گریب نواز (غریب نواز) عام ملتے ہیں۔

علاوہ ازیں اردو سنسکرت اور دوسری بھاشاؤں کے اور عربی فارسی کے درمیان ایک قسم کی مشکوفانیکا سی بن گئی تھی۔ اس سلسلے میں دین عیسیٰ کے مبلغین نے بھی اردو کی بڑی خدمت کی۔ انھوں نے انجیل مقدس کو اردو میں ترجمہ کر کے عوام تک پہنچایا۔ یہ کام سب سے پہلے ایک عیسائی مشنری مسٹر بنجمن شلز اور کلابرگ نے ۱۷۴۸ء میں کیا اور اس کے بعد انجیل مقدس کا اردو میں بار بار ترجمہ ہوتا رہا۔ یوں اردو زبان اسلام کے حلقۂ اثر سے نکل کر دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے حلقہ میں بھی پہنچنا شروع ہو گئی تھی۔ مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہندوستان میں کئی ایک مذہب آپس میں دست و گریباں نہیں تھے تو کم از کم ایک دوسرے سے ان کی چپقلش ضرور چل رہی تھی۔ اس وقت بدھ مت زوال پذیر تھا۔ ہندو مت اپنے احیاد کے لیے بڑی شد و مد سے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ کبیر داس اور تلسی داس ایک نئے بھگت کے مذہب کے راگ الاپ رہے تھے۔ سب مذاہب کی طرف سے اس کے مرکزی خیال یعنی خدا کو سمجھنے کی فلسفیانہ کوششیں جاری تھیں۔ کہیں ذات و صفات کا چکر تھا۔ کہیں شیو، کہیں وشنو اور کہیں رام کو خدا کہا جا رہا تھا۔ اسی دور میں آپس میں فلسفیانہ نکتوں پر بحث کرنے اور عارفانہ کلام کے لیے عربی فارسی کے الفاظ عام اس زمانے کی ہندی میں استعمال کیے جا رہے تھے، مثلاً تلسی داس کہتا ہے

؎ مایا کو ما پالے کر کر لیسے ہات   تلسی داس گریب کی کوئی نہ پوچھے بات

اسی طرح گورو نانک صاحب کا ایک دوہا "آب حیات" میں درج ہے۔

؎ ساس ماس سب جیو تمہارا   تو ہے کھرا پیارا
نانک شاعر ایو کہت ہے   سچے پروردیگارا

سورداس کہتا ہے۔

؎ مایا دھام دھن دھنتا   باندھیو ہوں اس ساج (ساز)
گنت سب ہی جانت ہوں   توڑ آئیو باج (باز)
کھیت بہت کاہے تم تانے   سن ستنی آواج (آواز)
دیوہ جات پار اترانے   چاہت چڑھیں جہاج (جہاز)

اردو پر فارسی کا رنگ

اردو کے آئینے میں ہمیں جن دوسری باہر کی زبانوں کے رنگین عکس نظر آتے ہیں ان میں عربی اور فارسی بہت نمایاں رہی ہیں۔ بھاشا کا اثر بہت گہرا ہے۔ ان تینوں زبانوں کے امتزاج سے اردو زبان کا خمیر اٹھا۔ دوسری زبانیں مثلاً پرتگالی، گجراتی اور ترکی ضرورت کے مطابق اردو کو فائدہ پہنچا گئیں۔ لیکن بھاشا اور عربی فارسی نے اردو پر اپنا گہرا اور دیرپا اثر چھوڑا۔ فارسی کے تلاطم نے بھی اردو کے دامن کو اپنے رنگا رنگ پھولوں سے مزین کیا۔ محمود غزنوی کے عہد سے لے کر مغلیہ دور کے آخری مراحل تک فارسی زبان کو درباری زبان رہنے کا اعزاز حاصل رہا۔ یعنی یہ سلسلہ کوئی آٹھ سو برس تک جاری رہا۔ درباری کاموں کے علاوہ دفتروں میں بھی یہی فارسی زبان استعمال ہوتی تھی۔ علمی اور ادبی رسالے بھی فارسی زبان میں ہی تصنیف و تالیف ہوتے تھے۔ فارسی سیکھنا اور فارسی میں بات کرنا باعث فخر ہی نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ فارسی زبان کے حصول کے بعد دربار اور دفاتر میں نوکری آسانی سے مل جاتی تھی۔ ہندو بھی بڑے شوق سے فارسی پڑھتے اور بولتے تھے۔ فارسی میں شعر کہتے تھے۔ دربار کا سارا ماحول ایرانی تھا۔ فارسی کے ساتھ ساتھ ملک میں ایرانی طرز معاشرت بھی نفوذ کر رہا تھا اس وقت کی ہندی زبان میں بھی فارسی تراکیب اور محاورے عام ہو گئے۔ فارسی نے اردو پہ گہرا اثر ڈالا۔ اس کے بعد جب دکن فتح ہوا اور وہاں بہمنیہ حکومت قائم ہوئی تو درباری زبان فارسی کی جگہ اردو ہو گئی۔ اس عہد میں اردو پر سے فارسی اور عربی کے اثرات کم ہوتے چلے گئے۔ لیکن فارسی ایک بار پھر درباری زبان بنا دی گئی۔

ایران سے جو ضروریات کی چیزیں اور آرائش کا سامان آتا، اس کے فارسی کے الفاظ ساتھ ہی آتے اور وہ بڑی آسانی سے ہندی یا اردو میں داخل ہوتے چلے گئے۔ ایسے ان گنت الفاظ اب ہماری زبان اردو کا ایک حصہ بن چکے ہیں جو کہ اصل میں فارسی کے ہیں اور ایران سے آئے تھے۔ محمد حسین آزاد نے اپنی کتاب "آب حیات" میں ایسے الفاظ کی ایک فہرست دی ہے جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ فارسی نے اردو کی کس قدر مدد کی۔ مثلاً پہناوے ہیں:۔ لبادہ، کرتہ، قبا، چوغا، آستین، گریبان، پائے جامہ، ازار، عمامہ، رومال، شال، دوشالہ، تکیہ، برقع، گاؤ تکیہ، پوستین۔

کھانے ہیں:۔ خوان، شیرمال، چپاتی، باقرخانی، پلاؤ، زردہ، مزعفر، قلیہ،

قورمہ، تفتن، زرنی، یاقوتی، حریرہ، حلیمہ، مربہ، اچار، فالودہ، گلاب، بید مشک، طبق، رکابی، تشتری، کفگیر، چمچہ، سینی، کشتی۔ اب دوسرے الفاظ ملاحظہ ہوں جن کی اصل فارسی ہے لیکن ہماری زبان اردو میں اردو کے ہی الفاظ سمجھ کر استعمال ہوتے ہیں۔

کیسہ، صابون، شمع، شیشہ، شمعدان، حمام، فانوس، گل گیر، تنور، نماز، روزہ، عید، شب برات، قاضی، ساقی، حقہ، نیچہ، چلم، تفنگ، زرد، خوبانی، بہی، ناشپاتی، شہتوت، سنگترے وغیرہ۔ اس سلسلے میں محمد حسین آزاد کہتے ہیں: "کئی ایک عربی، فارسی کے لفظ کثرت استعمال سے اس طرح جگہ پکڑ بیٹھے ہیں کہ اب ان کی جگہ سنسکرت یا خالص ہندی بھاشا کا لفظ ڈھونڈ کر لانا پڑتا ہے۔ اس میں یا تو اصل مطلب فوت ہو جاتا ہے یا زبان ایسی مشکل ہو جاتی ہے کہ عوام تو کیا خواص ہنود کی سمجھ میں بھی نہیں آتی۔ مثلاً دلال، فراش، مزدور، وکیل، جلاد، صراف، سزا، نصیحت، لحاف، توشک، چادر، صورت، شکل، چہرہ، طبیعت، مزاج، برف، فاختہ، قمری، کبوتر، طوطا، بلبل، پر، دوات، قلم، سیاہی، جلاب، رفو، چابک، صندوق، کرسی، لگام، رکاب، زین، تنگ، پوزی، نعل، کوتل، عقیدہ، وفا، جہاز، مستول، بادبان، منجنیق، درہ، پردہ، دالان، تہ خانہ، تنخواہ، علاج، تازہ، غلط، صحیح، کاریگر، ترازو وغیرہ۔

فارسی نے محاورات کے سلسلے میں بھی بڑا کام کیا اور اردو کے دامن کو مالا مال کیا۔ محمد حسین آزاد نے کچھ محاورے "آب حیات" میں دیے ہیں ملاحظہ ہوں۔

درآمدن۔ یعنی گھس آنا

یاں تک نہ دل آزاد خلائق ہو کہ کوئی
مل کر لہو منہ سے صف محشر میں در آئے — سودا

چشمک زدن۔ چشمک زنی

؎ لب پر تیرے پسینہ کی بوندہائے عقیق لب
چشمک زنی کرے ہے سہیل یمن کے ساتھ — ذوق

پیمانہ پُر کردن۔ مار ڈالنا

؎ ساقی چمن سے چھوڑ کے مجھ کو کدھر چلا
پیمانہ میری عمر کا ظالم تو بھر چلا — سودا

دامن افشاندہ برخاستن۔ بیزار ہو کر اٹھ کھڑے ہونا

؎ کیا اس چمن میں ان کے سے جائے گا کوئی
دامن تو میرے سامنے گل جھاڑ کر چلا — سودا

از جامہ بیرون شدن (آپے سے باہر ہونا)

؎ نکلا پڑے ہے جامے سے کچھ ان دنوں رقیب
تھوڑے سے ہی دم دلاسے میں اتنا ابھر چلا — سودا

دل دادن۔ عاشق ہونا

؎ دل دے کے تم کو جان پہ اپنی بری بنی
شیریں کلامی آپ کی میٹھی چھری بنی — ظفر

تر دامن۔ فارسی اصطلاح میں گناہ سے پُر

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

چراغ سحری۔ جان بلب بیمار

؎ تک میر جگر سوختہ کی جلد خبر لے
کیا یار بھروسا ہے چراغ سحری کا — میر

تر آمدن۔ یعنی شرمندہ ہونا۔

؎ کھلنے میں تیرے منہ کی کلی پھاڑے گریباں
آگے تیرے رخسار کے گل رنگ تر آوے — میر

دستے در ایں کار دارد یعنی وہ اس کام میں مہارت رکھتا ہے

کون ایسا ہے جسے دست ہو دل سازی میں
شیشہ ٹوٹے تو کریں لاکھ ہنر سے پیوند

علاوہ بریں بے شمار محاورے، ترکیبیں اور اصطلاحیں ہیں جو فارسی زبان سے اردو میں آئیں اور اردو میں بالکل اسی حالت میں آج تک قائم ہیں۔ مثلاً باد صبا، زر خرید، درد دل، گردش فلک، وادی غربت، جان بلب، عہد شباب، صاحب ایمان، غم روزگار، گرمی بازار، نور چشم، برخوردار، لخت جگر، مال غنیمت، شب ماہ برائے نام۔

محمد حسین آزاد اپنی مشہور کتاب "آب حیات" میں لکھتے ہیں کہ اردو گرامر اور قاعدے میں بھی فارسی کو بہت دخل ہے۔ اسم فاعل، اسم ظرف، حرف شرط، واؤ عاطفہ، حرف استثنا، حروف نفی، حروف تمنا، حروف تاکید، یہ سارے فارسی میں سے اردو میں آئے ہیں مثال کے طور پر ملاحظہ ہو۔

اسم فاعل:۔ سمجھدار، خطاکار، گنہگار، فیل بان، حیلہ ساز، دغاباز
اسم ظرف:۔ قتل گاہ، قلمدان، قیدخانہ، مے کدہ۔
حروف شرط:۔ اگر، اگرچہ
واؤ عاطفہ:۔ آب و ہوا، شب و روز، صبح و شام، زور و شور
حروف استثنا:۔ مگر، بجز، لیکن۔
حروف نفی:۔ نہ، نے۔
حروف تاکید:۔ ہرگز، زنہار، ضرور، البتہ
حروف تمنا:۔ کاش
حروف ترقی:۔ بلکہ

ڈاکٹر اعجاز حسین ایم اے ڈی لٹ نے "اردو شاعری پر مذہب کا اثر" نامی جو مقالہ ڈاکٹریٹ کے لیے لکھا تھا اور جسے الہ آباد پبلشنگ ہاؤس نے شائع کیا اس میں وہ فرماتے ہیں۔

" فارسی سے بہت کچھ لے کر اردو والوں نے بھاشا کے بھی اکثر الفاظ نئے طور پر گڑھ لیے۔ یہ کاریگری قابل دید ہے نہ صرف اس وقت کے لوگوں کی ترقی پسندی کا ثبوت دیتی ہے بلکہ ان کی دور اندیشی و خلاقی طبع کا بھی ایک نمونہ ہے، چنانچہ فارسی کے اصول پہ بھاشا میں بھی اسم فاعل و اسم ظرف تیار کیے گئے۔ مثلاً گاڑی بان، پاندان، پیک دان، مودی خانہ، سمجھدار، مصدروں کے لحاظ سے اردو پہ زیادہ اثر ہندی کا ہوا لیکن فارسی نے بھی بہت اثر کیا اور فارسی سے مدد بھی لی گئی۔ اگرچہ اس میں ہندی والوں نے بہت تراش خراش کر لی۔ مثلاً گزشتن سے گزرنا۔ بخشیدن سے بخشنا۔ نواختن سے نوازنا۔ فرمودن سے فرمانا، غرض اس قسم کے الفاظ آپ کو بہت ملیں گے جن کا مخرج فارسی ہے لیکن

اردو نے اسے اپنے سینے سے لگالیا۔"

اُردو کے شروع کے دَور میں بھاشا نے فارسی کے ساتھ سوتیلی ماں ایسا سلوک نہیں کیا تھا اور بھاشا میں فارسی کے محاورے اور ترکیبیں جوں کی توں آجاتی تھیں۔ لیکن بعد میں فارسی کی جو ترکیب بھی اردو میں آئی اس کو اردو نے اپنی سرشت اور مزاج کے مطابق تبدیل کر دیا۔ مثال ولی دکنی کے ایک شعر کی ہے جس میں فارسی کے ساتھ فراخ دلی کا سلوک کیا گیا ہے۔

گنگا رواں کیا ہے نین سے آپس سینی
آ اے صنم شتاب ہے روز نہاں آج

محمد حسین آزاد اور ڈاکٹر عبدالحق نے "آبِ حیات" اور میر تقی میر کی کتاب نکات الشعرا میں ایک شعر مظہر جانِ جاناں کا لکھا ہے۔

کسے خون کا پیاسا کسی کی جان کا دشمن
نہایت منہ لگایا ہے مسی میں بیڑہ پان کو

محمد حسین آزاد لکھتے ہیں: "ترکیب اضافی اور ترکیب توصیفی کہیں مبتدا ہو کر کہیں خبر ہو کر ہندی پر چھا گئی۔ اس میں پہلا فائدہ یہ ہوا کہ اختصار کے لحاظ سے لفظوں کا پھیلاؤ کم ہو گیا۔ لاحقہ اور سابقہ زیادہ تر فارسی ہی سے اردو میں لے گئے۔ جبکہ ان کی تعداد بہت کم ہے مگر جتنے بھی آئے وہ فارسی ہی سے زیادہ تر آئے۔ مثلاً غیر، اہل، پُر، بد وغیرہ اور واری، بست، ستان، نگاہ، گیر، پاش، ناک، وہ، وار، بیز وغیرہ

استعارے اور تشبیہ کے معاملے میں بھی فارسی کے اردو پر بہت احسان ہیں۔ ہم روزمرہ میں سیکڑوں تشبیہیں اور استعارے استعمال کرتے ہیں جو فارسی سے اردو میں آئے ہیں۔ یوں سمجھیں کہ فارسی زبان نے ہر جہت سے اردو زبان پر اپنا اثر ڈالا اور اسے گوناگوں دلکشی عطا کی۔ کیا استعارہ کیا تشبیہ، کیا محاورے اور کیا تراکیب، ہر اعتبار سے فارسی نے اس کو مالا مال کیا۔ اس کا ایک نتیجہ واضح طور پر یہ نکلا کہ اردو کا مزاج بہت حد تک ایرانی ہو گیا۔ خاص طور پر لکھنؤ کے دبستانِ شاعری نے اس مزاج کے ایرانی اجزا کو زیادہ تقویت دی۔ ہمارا تخیل اور سوچنے اور فکر سخن کا انداز ایرانی ہو گیا۔ غزل، مثنوی اور دیگر اصنافِ سخن سارے کے سارے فارسی ہی سے ادھر آئے تھے۔ دوسرے متوسط عہد اور قدیم عہد کے اکثر شعرا اہلِ فارس تھے وہ بادشاہوں اور فاتحین کے ساتھ باہر سے آئے تھے اور اپنے ساتھ فارسی زبان کی ساری روایات لائے تھے۔ ایسے شاعر تھے جو فارسی زبان میں شعر کہتے تھے۔ مثلاً مظہر جانِ جاناں، سراج، حاتم، میر، سودا، نظیر اور غالب کا تو فارسی کلام آج بھی موجود ہے۔ اس اعتبار سے ہم بلاشبہ کہہ سکتے ہیں کہ شروع ہی سے اردو کے ذہن کو فارسی شاعری اور فارسی نثر نگاری کے اسلوب نے ہی متاثر کیا اور اردو کی صنف سخن پر فارسی کا گہرا اثر پڑ گیا۔

اس زمانے میں فارسی ادب بہت ترقی کر چکا تھا۔ شعر اور نثر نے اپنا ایک مقام بنا لیا تھا۔ اُردو کے ابتدائی دَور میں شعرا کا فارسی کی طرف رجوع ہر اعتبار سے اردو شاعری کے لیے مفید ثابت ہوا۔ لطافت، بلندیٔ تخیل، خیال آفرینی اور مضمون کی بندش میں فارسی نے دَورِ متوسط کے شعرائے کرام کی خاص طور پر بہت رہنمائی کی۔ فارسی نے مختلف اصنافِ سخن دیئے جو ویسے کے ویسے ہی اردو شاعری میں رواج پا گئے۔ ان میں غزل، قصیدہ، مثنوی، رباعی وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح فارسی کی بحریں بھی ویسی کی ویسی اردو میں منتقل ہو گئیں۔ پھر ایک ہی دین کے پیروکار ہونے کی وجہ سے ایران اور ہندوستان کے مسلمان ایک دوسرے سے بہت قریب تھے۔ ان کی مذہبی روایات ایک جیسی تھیں اگرچہ یہ ساری کی ساری بحریں اور عروض عربی سے آئے تھے لیکن اردو کو یہ ورثہ فارسی کی وساطت سے ملا۔ اہلِ فارس نے ان بحروں میں کچھ تبدیلیاں کر دی تھیں جنہیں اردو نے بھی مع ساری تبدیلیوں کے قبول کر لیا تھا۔ مثلاً بحرِ رمل، بحرِ ہزج، بحرِ کامل، بحرِ متقارب، بحرِ بسیط، بحرِ خفیف، عربی الاصل ہیں۔ لیکن فارسی والوں نے انہیں قبول کرنے سے پہلے ان میں جو تبدیلیاں کیں اردو والوں نے انہیں برقرار رکھا اور ان میں ذرا سا بھی فرق نہ ڈالا۔ مثلاً" ایک بحر ہے بحرِ ہزج۔ اس کو عربی والے جس وزن میں کہتے ہیں فارسی والے اس وزن کو دوگنا کر لیتے ہیں۔ اردو والوں نے بھی اسی فرق کو برقرار رہنے دیا۔ یعنی یہ چار رکن کا ایک بیت ہو جاتا ہے۔ چار رکن کا ایک مصرعہ ہے۔

میرا سینہ ہے مشرقِ آفتاب داغِ ہجراں کا

عربی میں عام طور پر قافیے کی پابندی پہ زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ عربی شاعری میں ردیف کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی۔ جبکہ فارسی میں یہ صنفِ سخن آئی تو فارسی والوں نے ردیف پہ زیادہ زور دینا مناسب خیال کیا۔ ردیف کی فارسی میں بڑی اہمیت ہو گئی۔ اسی اعتبار سے اردو میں بھی ردیف پہ زیادہ زور دیا جانے لگا۔ مغل بادشاہ سارے کے سارے فارسی بولتے تھے اور ان کا تعلق کسی نہ کسی طرح سے ایرانی کلچر سے تھا۔ چنانچہ ان کا اثر فارسی زبان کے اثر کے ساتھ مل کر ہندوستان کی معاشرت پہ یہ پڑا کہ یہاں کی طرزِ معاشرت میں ایرانی کلچر در آیا۔ مذہب نے بھی اس کام میں بڑا اہم رول ادا کیا۔ فارسی کے شاعروں نے مسلمان ہونے کی حیثیت سے جن جن عقائد اور نظریات کو اپنے شعر میں جگہ دی تھی اردو کے شاعروں نے بھی ان پہ نظمیں لکھیں۔ کیونکہ وہ مسلمان تھے اور وہی عقائد و نظریات ان کو بھی عزیز تھے۔ لیکن ایک بات یہاں خاص طور پہ یاد رکھنے کے قابل ہے وہ یہ کہ اردو کا مزاج خاصا ترقی پسند اور فراخ تھا۔ دینی عقائد کے ساتھ ہی ساتھ وہ فارسی کے اس ادب اور شعر کو بھی اپنے ہاں نمایاں جگہ دے رہا تھا جن کا تعلق کسی طرح سے بھی اسلام سے نہیں تھا۔ اس کا ثبوت وہ تمام غیر اسلامی شخصیات ہیں جو مشرق وسطیٰ کی تاریخ کا ایک ناقابلِ تردید حصہ ہیں۔ مثلاً رستم، شیریں فرہاد، سہراب، چاہ نخشب، مانی، جمشید، سکندر و دارا وغیرہ۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اردو کے مزاج میں اپنے ماحول سے متاثر ہونے کی صلاحیت بھی تھی۔ وہ ایک باشعور زبان بنتی جا رہی تھی۔۔ اردو شعر فارسی کے سانچے میں ڈھل کر نکلا لیکن اس سانچے سے باہر نکل کر اس نے اپنا ایک خاص مقام حاصل کیا۔ اپنی ایک شخصیت استوار کی اور ایک انفرادیت حاصل کی یہی اردو کی سب سے بڑی خوبی تھی۔

اردو زبان ایرانی تہذیب و تمدن سے بھی بہت متاثر ہوئی۔ اس بات کو ہم خاص طور پر محسوس کرتے ہیں کہ ایرانی تہذیب و تمدن کے سلسلے میں متاثر ہونے میں اردو نے ایرانی ادب سے بہت زیادہ اثر قبول کیا۔ مثلاً امرد پرستی اردو والوں کے ہاں پہلے بالکل نہیں تھی۔ لیکن ایرانی ادب میں اس کا شروع ہی سے بہت چرچا تھا۔ چنانچہ اردو زبان ایرانی تہذیب کے اس پہلو سے بہت متاثر ہوئی اور امرد پرستی جوں کی توں اردو شاعری میں بھی آ گئی۔ اسی طرح استعارہ میں بھی فارسی ادب کا اثر نمایاں طور پر نمودار ہوا اور ہیر رانجھا، ہزار داستان، لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد اور مانی اور بہزاد کے موئے قلم نے اردو کے دامن کو اپنی گلکاریوں سے لالہ زار بنا دیا۔

فارسی رمزیات اردو میں

اگر ہم فارسی کی بحروں اور اوزان کو پس پشت ڈال کر اس کی رمزیات اور تلمیحوں کو دیکھیں تو ہمیں محسوس ہوگا کہ اردو شاعری میں ایسے مقامات کا ذکر ملتا ہے جو ہندوستان میں نہیں ہیں لیکن اردو شاعری میں ان کا ذکر جگہ جگہ ملتا ہے۔ مثال کے طور پر ماہ نخشب، طاق کسریٰ، جام جم، چاہ بابل، خامۂ مانی، سد سکندر، درفش کاویانی، گنج قارون، احمد حرم، دیوار قہقہہ، جوئے شیر، قصر فریدوں، عصائے موسیٰ وغیرہ۔ کچھ شخصیتیں بھی اردو کے ایوان غزل و نظم میں آ گئیں۔ جن کا تعلق خاصتاً ایران سے تھا مثلاً نمرود، قارون، نوشیرواں، خسرو پرویز، بہرام گور اور بہزاد وغیرہ۔ مقامات کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں۔ ان میں فرات، جیحوں ، کوہ طور، کوہ الوند، کوہ البرز، کوہ بے ستون، کنعان و روم خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ ساری شخصیات، مقامات اور رمزیات اردو کا کلاسیکی ورثہ بن جاتے ہیں جبکہ ان کا ہندوستان سے کوئی تعلق نہیں ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ ان میں سے بعض رمزیات اور اسماء عرب سے آئے ہیں پھر بھی یہ سارے کا سارا خزانہ اردو کو فارسی ہی کی وساطت سے میسّر آیا۔ فارسی اشارات اور تلمیحات کے اردو میں آنے سے اردو کا دامن وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ اردو کا مزاج آفاق گیر ہو گیا۔ جس کی وجہ سے اردو کی ترقی کی رفتار تیز تر ہو گئی۔ اسی طرح سے اردو نے بھاشا اور دوسری غیر ملکی زبانوں مثلاً ترکی، انگریزی، فرانسیسی اور پرتگالی سے بھی پورا پورا استفادہ کیا یہاں تک کہ روسی زبان کے بعض الفاظ بھی اردو میں آ گئے جو آج تک اردو زبان میں رائج چلے آ رہے ہیں۔ جب کسی دوسری زبان کے استعارے کسی زبان میں آتے ہیں تو اپنے ساتھ اس زبان کی چاشنی اور روایات کا حسن بھی ساتھ لاتے ہیں۔ مثال کے طور پر عمل پیہم کی تلمیح اردو میں ایک ایسی جامع اور حسین مقام حاصل کر چکی ہے کہ ہماری اردو غزل کا ایک قابل ذکر حصہ اس کے حسن سے جگمگا رہا ہے۔ ایرانی پھولوں، پتوں اور پرندوں نے بھی، یہاں اردو کے اشجار پر وہ نغمہ سرائی کی کہ ان کی بھینی نغمگی سے آج بھی دل مسحور ہوتے ہیں۔ ان تلمیحات کو اردو کے عظیم شعرا نے ایک نئے اور گہرے معنی بھی عطا کیے۔ غالب نے تو فارسی رمزیات اور تلمیحات کو اس ژرف نگاہی، تیزی فکر اور خیال آفرینی سے پیش کیا کہ ایک ایک شعر کے کئی کئی مفہوم پیدا ہو گئے۔ یہی حال دوسرے شعرا کا ہوا کہ انہوں نے فارسی استعاروں کے ساتھ اردو شاعری کو ایک انمول خزانہ عطا کر دیا۔

علاوہ بریں فارسی شاعری نے اردو شاعری کے قالب میں ایک نئی روح بھی پھونکی شروع ہی سے اردو کے شعرا دینی عقائد کے ہم شکل ہونے کی وجہ سے عربی اور فارسی شاعری اور دوسرے ادب سے برابر استفادہ کرتے رہے تھے۔ اردو پر فارسی کا غلبہ تھا۔ چونکہ باہر سے زیادہ تر ایسے مسلمان فاتح یہاں آئے تھے جن کی زبان فارسی تھی اور مذہب اسلام تھا۔ یوں اسلامی نظریات بھی زیادہ تر فارسی ہی کی وادی سے ہو کر ہم تک پہنچے۔ دینی اعتبار سے ہماری شاعری پر سب سے زیادہ اثر صوفیائے کرام اور بزرگان دین کی شاعری اور نثر نگاری کا پڑا ہے۔ جس پرگوئی سے صوفیائے کرام نے فارسی زبان میں شاعری کی اس نے بھی اردو زبان کو بہت متاثر کیا اور بہت فائدہ پہنچایا۔ خاص طور پر صوفیانہ شاعری میں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو شاعروں نے بھی اپنی فارسی صوفی شعرا کے تتبع ہی میں بہت زیادہ شاعری کی۔ اردو شاعروں کا طرز فکر شروع شروع میں فارسی زبان کی صوفیانہ شاعری سے مماثل دکھائی دیتا ہے۔ دراصل اردو زبان کے ایک خاص شکل اختیار کرنے سے پہلے فارسی میں صوفیانہ شاعری پر بے پناہ کام ہو چکا تھا۔ اس زبان میں بڑے بڑے عظیم صوفی شاعر طبع آزمائی کر چکے تھے۔ مثلاً مولانا روم، عطار، حافظ، سعدی اور شمس تبریز۔ یہ وہ اصحاب تھے کہ ان کی حیثیت ایک صوفی کے طور پر بھی مسلم تھی اور شاعر کے طور پر بھی دیکھا جائے تو وہ بہت بڑے شاعر تھے۔

اس کے ساتھ ہی ساتھ فارسی زبان کی بے شمار ایسی کتابیں ترجمہ ہو کر اردو میں منتقل ہوئیں جن کا تعلق خالصتاً مذہب اور تصوف سے تھا۔ ان اردو تراجم میں الفاظ، اسماء، تلمیحات رمزیات اور اصطلاحیں ویسی کی ویسی ہی رہیں۔

اردو زبان میں عشق

اردو زبان کو شعر اور نثر کے عاشقانہ مضامین نے بھی ترقی کی راہ دکھائی عشق کا دریا جلا کر اردو کا سفر عروج کی منزلوں کی طرف اس کی روشنی میں روانہ ہوا۔ ابتدا میں بھی اردو ادب میں عاشق ایرانی النسل دکھائی دیتا ہے۔ لیکن بعد میں ہندوستان کی عاشقانہ دیومالا نے بھی اردو کو متاثر کیا اور ایرانی عاشق نے آہستہ آہستہ اپنا چولا ایرانی کپڑوں سے بدل کر ہندوستانی کر لیا مگر عاشقانہ بندش میں جو اصطلاحیں رائج ہوئی تھیں وہ ابھی تک ویسی کی ویسی ہیں مثلاً رقیب کا جو تصور ہماری اردو شاعری میں مروّج ہے وہ خالص اور سو فیصد ایرانی ہے۔ ہندوستان کی قدیم شاعری اور برج بھاشا میں بھی ایسا رقیب کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ عاشق کا سراپا بھی اردو میں وہی ہے جو فارسی میں تھا اور ہے۔ اردو کا عاشق وہی کچھ کرتا ہے جو فارسی شاعری میں ایک روایتی عاشق کرتا ہے۔ وہ نالے کرتا ہے۔ ہجر میں اختر شماری کرتا ہے۔ معشوق سے گلے شکوے کرتا ہے وصل کے انتظار میں راتیں اور دن تڑپ تڑپ کر گزارتا ہے۔ ہجر میں روتا ہے اور وصل میں بھی اس بات کا فکر کرتا ہے کہ وصل کی رات بہت جلد ختم ہو جائے گی۔ صبح ہو جائے گی اور اس کا محبوب چلا جائے گا۔ جب ہم معشوق کے سراپا پر نظر ڈالتے ہیں تو اس کی شکل و صورت قد کاٹھ، چال ڈھال وہی نظر آتی ہے جو مانی و بہزاد کی تصویروں میں ہے، یعنی زلفیں، پتلی کمر، صراحی دار گردن، لمبی پلکیں، بڑی آنکھیں، تنگ دہن وغیرہ، جبکہ ہندوستان کے قدیم ادب میں ہمیں محبوب کا سراپا اس سے بالکل مختلف ملتا ہے۔ جے دیو اور امارو بنگال اور جنوبی ہند کے بہت بڑے شاعر تھے۔ ایک نے بنگال میں شاعری کی اور دوسرے نے سنسکرت میں۔ جے دیو نے رام سیتا کی کتھا بھی لکھی۔ اس کے ہاں کرشن کی گوپیوں کا سراپا ایرانی معشوق کے سراپے سے بالکل مختلف ہے۔ یہی حال امارو کا ہے۔ اس کی محبوبہ کا دہن فراخ ہے۔ ہونٹ پتلے نہیں بلکہ موٹے ہیں۔ آنکھیں باریک نہیں موٹی ہیں چہرہ لمبوترا نہیں گول ہے۔

شروع شروع کی دکنی اردو اور برج بھاشا کی شاعری میں ہمیں شاعر اور نثر نگاروں کے محبوب سنسکرت اور بنگال کے سراپا ۔ سے متاثر نظر آتے ہیں لیکن بعد میں جب فارسی نے شمالی ہند کے دروازے سے ایک سیلاب کی مانند اپنا راستہ بنایا تو پانی : ردو پر فارسی کا زبردست غلبہ ہونے لگا۔ اردو شاعری اور نثر قدیم بھاشاؤں کی تراکیب تلمیحوں اور استعاروں سے دور ہٹتی چلی گئی اور فارسی کے اثرات میں آنا شروع ہو گئی اور پھر جب فارسی پوری طرح غالب آ گئی تو اردو کا معشوق ایرانی بن گیا۔ اس کی گردن صراحی دار ہو گئی اور ہونٹوں کا دہانہ تنگ ہو گیا۔ یہی حال اردو شاعری کے عاشق کا بھی ہوا۔ کبھی وہ تیر کمان لے کر اپنی محبوبہ کی تلاش میں نکلتا تھا اور اپنے رقیبوں سے نبرد آزما ہوتا تھا لیکن اب اس نے اپنی محبوبہ کی یاد میں آنسو بہانے اور آہیں بھرنی شروع کر دیں۔ اس کے مزاج پر ایرانی مزاج گہرا اثر کرتا چلا گیا یہاں تک کہ ایک وقت آیا کہ وہ سرتاپا ایرانی محبوب اور ایرانی عاشق بن کر رہ گیا۔ وہ بات بات پر اپنا گریبان چاک کرتا ہے۔ وہ حواس باختہ رہتا ہے۔ بہار آتی ہے۔

تو کپڑے پھاڑ کر صحراؤں میں نکل جاتا ہے وہ دل پہ پتھر رکھ کر ہجر کے صدمے سہتا ہے لیکن معشوق کے سامنے حرف شکایت زبان پر نہیں لاتا۔ وہ بار بار کوئے ملامت میں جاتا ہے۔ محبوب کے گھر کے پاسبان کے پاؤں پڑتا ہے۔ اس کی گالیاں برداشت کرتا ہے۔ اسے کچھ نہیں کہتا۔ وہ نصیحت کرنے والے سے لڑتا ہے، جھگڑتا ہے۔ زاہد کو برا بھلا کہتا ہے۔ اپنے آپ کو ایک مصیبت زدہ انسان کی شکل میں پیش کرتا ہے۔ وہ زندہ رہ کر بار بار مرنے کی تمنا۔ کرتا ہے۔ اسے زندگی سے پیار نہیں ہے۔ وہ خودکشی کی خواہش کرتا ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ اب اردو شاعری کے عاشق کا موازنہ اگر ہم قدیم ہندی شاعری کے عاشق سے کریں تو حیرت ہوتی ہے کہ ہم کہاں سے کہاں آن پہنچے ہیں۔

اصناف سخن میں جن اصناف نے اردو شاعری کی ذہنیت کو متاثر کیا ان میں قصیدے کا نام سر فہرست ہے۔ قصیدہ عام طور پر کسی امیر، کسی نواب یا بادشاہ کی تعریف و توصیف میں لکھا جاتا تھا اس میں اس قدر مبالغے سے کام لیا جاتا تھا کہ اکثر ایسی خوبیاں بھی موصوف سے وابستہ کر دی جاتی تھیں جن کا ان صاحب سے دور کا بھی تعلق نہیں ہوتا تھا۔ یہ صنف بھی فارسی زبان سے اردو میں آئی تھی۔ فارسی زبان میں بڑے بڑے اجل قصیدہ گو شاعر تھے۔ جن میں عرفی، خاقانی اور قاآنی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان شعرا کے قصیدے آج ادب میں کلاسیکی مقام حاصل کر چکے ہیں۔ محمد حسین آزاد اپنی کتاب "آب حیات" میں لکھتے ہیں۔

> "ہم اپنے ایسے خیالات قصیدے میں پیدا کرتے ہیں کہ جو اکثر ملک عرب فارس یا ترکستان کے ساتھ قومی یا مذہبی خصوصیات رکھتے ہیں۔"

فارسی کے قدیم شعرا تو بادشاہوں اور بڑے بڑے فاتحین کی مدح سرائی کرتے تھے۔ وہ بابر، ہمایوں اور اکبر ایسے بادشاہوں کے قصیدے لکھتے ہوئے اپنا زور بیان خرچ کرتے تھے۔ مگر بعد کے اردو شعرا نے ویسا ہی زور بیان اور شکوہ الفاظ معمولی قسم کے زوال پذیر نوابوں اور والیان ریاست کے لیے بھی استعمال کیا جن کی حیثیت کچھ بھی نہیں تھی۔ اگر تھی تو محض اتنی کہ وہ قصیدہ گو شاعروں کو انعام و اکرام، دیا کرتے تھے۔ اس کے باوجود اردو میں جو قصائد لکھے گئے ان میں زور بیان کے ساتھ ساتھ اختصار سے بھی کام لیا گیا اور اسے کلاسیکی ادب میں ممتاز جگہ پر لا کھڑا کیا۔ آزاد لکھتے ہیں۔

> "رات کو اہل محبت کے جلسے میں ساقی کا آنا واجب ہے پھر معشوق بجائے ایک نازنین کے پری زاد لڑکا ہو۔ اس کی پیشانی اور رخسارہ سے نور صبح روشن ہو۔ مگر زلف کی شام بھی برابر مشک افشاں رہے۔ صراحی کبھی سرکشی کرتی ہے۔ اس لیے جگر خون ہو کر ٹپکتا ہے۔ کبھی جھکتی ہے اور خندۂ قلقل سے ہنستی ہے۔ کبھی وہی قلقل حق حق ہو کر یاد الٰہی میں صرف ہو جاتی ہے مگر پیالہ اپنے کھلے منہ سے ہنستا ہے اور اس کے آگے دامن بھی پھیلاتا ہے فلک تیر حوادث کا ترکش اور کمان کہکشاں لگائے کھڑا ہے۔ مگر عاشق کا تیر آہ اس کے سینے سے پار ہو جاتا ہے۔ پھر بھی زحل منحوس کی آنکھ نہیں پھوٹتی کہ عاشق کی صبح مراد روشن ہو۔ یہاں کی محفل میں شمع برقع فانوس میں تاج زر سر پر رکھے کھڑی ہو۔ اس لیے پروانہ کا آنا بھی واجب ہے اور وہ عاشق زار آتے ہی جل کر خاک ہو جاتا ہے۔ چراغ کو ہنساتے ہیں اور شمع کو عاشق کے غم میں رلاتے ہیں۔ وہ باوفا عاشق کو غم میں سدا جلتی ہے اس کی چربی گھل گھل کر بہتی ہے۔ مگر پائے استقامت اس کا نہیں ٹلتا۔ یہاں تک کہ سپیدۂ سحری کبھی کا آکر کافور دیتا ہے اور کبھی تباشیر شمع کا دل اس لیے بھی گداز ہے کہ شب زندگی کا دامن بہت چھوٹا ہے۔ مگر صبح دونوں کے ماتم میں گریباں چاک کرتی ہے۔ عاشق بادہ خوار کے لیے مرغ سحر بڑا موذی ہے۔ اس کے ذبح کو ہمیشہ تیغ زبان تیز رہتی ہے۔ ہمدم باد سحر خجستہ گام ہے کہ پیام یار کا بہت جلد لاتا ہے اور لے جاتا ہے۔ اسی عالم میں آفتاب کبھی تو پنجۂ شعاع سے آنکھ ملتا سر برہنہ حجرۂ مشرق سے نکلتا ہے۔ کبھی فلک کا سبزہ گھوڑے پہ سوار کرن کا تاج زرنگار سر پہ چمکاتا شفق کا پھریرا اڑاتا آتا ہے۔ کیونکہ اپنے حریف شاہ انجم کی فوج کو پریشان کر کے فتح یاب آیا ہے۔"

اس عبارت سے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اردو پر فارسی کے علاوہ عرب اور ترکی تہذیب و الفاظ کا بھی اثر اتنا ہی نمایاں تھا اور اس میں کوئی شک بھی نہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر فارسی کے علاوہ کسی تہذیب کا اثر اردو میں آیا تو وہ بھی فارسی ہی کے ذریعے اور اسی کے حوالے سے ہو کر آیا۔ اس لیے بلاواسطہ یا بالواسطہ اردو پر فارسی ہی کا اثر غالب رہا ہے۔ کیونکہ ساری کی ساری رسمیں ایرانی ہیں، ساری تلمیحات فارسی کی ہیں اور کچھ باقی جو غیر ایرانی ہیں وہ بھی ایران سے ہو کر ہمارے پاس آئی ہیں۔

لیکن اس کے باوجود ہم کلیتاً یہ نہیں کہہ سکتے اور ہمارے یہ لکھنے کا مقصد بھی ایسا نہیں ہے کہ اردو زبان فارسی کی پناہ گیر رہی۔ یا فارسی ہی کی ایک تابع تھی۔ کیونکہ اردو میں ایک بات ہر دور میں بڑی نمایاں رہی ہے کہ اس نے ہر طوفان، ہر ابتلا، اور ہر آزمائش کے دور میں اپنی انفرادیت کو ہر حالت میں برقرار رکھا۔ اگرچہ اردو فارسی کے الفاظ شروع شروع کے زمانے میں ایک جیسے تھے اور ابتدائی دور میں خیالات اور تخیل بھی ایک جیسا ہی تھا۔ دونوں کی جزئیات میں بھی کوئی زیادہ فرق نہ رہا۔ پھر بھی دونوں کا مزاج روز اول سے ایک دوسرے سے مختلف رہا۔ اردو نے اپنے مزاج کی جزئیات کو ہمیشہ الگ اور منفرد رکھا ہے۔

دنیا میں اکثر دانشمند ایک ہی طرح سے سوچتے چلے آئے ہیں۔ دونوں کی دانشمندی کی باتوں میں کوئی فرق نہیں رہا ہے یونان اور چین کے قدیم فلاسفروں کے ایک ہی طرح کے مقولے مشہور ہیں۔ خیالات کی بنیاد ایک جیسی ہی رہی ہے۔ اس کے باوجود دونوں کے بات کرنے کا انداز۔ اپنے اپنے ملک کے حالات کے مطابق رہا ہے۔ فارسی اور اردو کا بھی کچھ ایسا ہی حال رہا ہے۔ ہمارے اردو کے اساتذہ نے فارسی کی پیروی ضرور کی مگر اس کے باوجود انہوں نے اپنی انفرادی شخصیت کو مجروح نہیں ہونے دیا۔ اپنی انفرادیت کو ضائع نہیں ہونے دیا۔ اپنے مزاج کی علیحدگی کو برقرار رکھا۔ اس کی کئی ایک قدرتی وجہیں ہیں۔ سب سے بڑی اور پہلی وجہ تو یہ ہے کہ ایران اور ہندوستان کی آب و ہوا میں فرق تھا۔ وہاں کے رہنے والوں کے مزاجوں میں فرق تھا۔ جغرافیائی تفریق نے ذہن کو، مزاج کو، الگ الگ کر رکھا تھا۔ اس کے بعد ذاتی تجربے اور ماحول کی ہم آہنگی نے بھی دونوں مزاجوں کو الگ الگ رکھا۔ ہاں رجائیت اور قنوطیت میں ہمیں ہم آہنگی دکھائی دیتی ہے۔ مثلاً جو قنوطیت میر تقی میر کے ہاں دیکھنے میں آتی ہے وہی قنوطیت اور سوز و گداز فارسی کے شاعروں میں بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ لیکن فارسی کی شیرینی اور لطافت یہاں بھی ہیں میر تقی میر ان سب سے الگ دکھائی دیتا ہے۔ محض اس لیے کہ میر کے ہاں جو سوز و گداز، لہجے کی برجستگی، تجربے کا انوکھا پن اور لہجے

کی مٹھاس اور خیال کا سوز و گداز ہے وہ فارسی والوں کے پاس نہیں تھا۔ میرؔ کے پاس قدیم ہندی زبان کا لہجہ بھی ہے جو فارسی کے پاس نہیں۔ مثلاً میرؔ کا ایک عام سا شعر ہے کہ ؎

مر گئے کو بھی اس غم میں ہیں آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل ہے

غالبؔ کی مثال بھی ہمارے سامنے ہے کہ اس نے جتنے اردو میں شعر کہے قریب قریب اس کے برابر ہی فارسی میں بھی کہے۔ فارسی اس کے مزاج کے بہت قریب تھی لیکن جو خیال کی گہرائی ہمیں اردو میں ملتی ہے وہ فارسی میں نہیں ہے۔ اس لحاظ سے بھی اردو نے فارسی کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بھی اپنی انفرادی شخصیت کو برقرار رکھا۔

ایران کا کوئی بھی شاعر فارسی زبان کی دولت مندی کے باوجود میر تقی میرؔ کے آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل والے مصرعے کا جواب پیدا نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اس میں یہ خاص ہندوستانی محاورہ ہے جو شاعر نے امتیازی شان کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ ایک اور مثال میر انیسؔ کی ہے ؎

؎ جیسے کوئی بھونچال میں گھر چھوڑ کے بھاگے

اس مصرعے میں بھونچال کے صوتی اثرات سے جو کیفیت زلزلے کی سامنے آتی ہے وہ فارسی اور عربی کے زلزلے سے ذرا کم ہی پیدا ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ زلزلے میں ایک حرکت اور کپکپاہٹ ضرور ہے۔ لیکن بھونچال میں ایک افراتفری اور گھبراہٹ کا احساس پایا جاتا ہے یہ تو وہ فرق ہے جو الفاظ کی نشست و برخاست سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کے بعد لفظوں کا چناؤ اور مزاج کا فرق بھی ہے۔ ماحول کی امتیازی خصوصیات بھی ہیں۔ مشاہدہ اور ضرورت بھی تفصیلات میں علیحدگی پیدا کرتی ہے۔ ہندوستان کا معاشرہ طرزِ زندگی اور ملک میں سیاسی انقلاب بھی اپنے شروع کے دور میں فارسی کو اردو سے دور لے جا رہے تھے۔

اُردو کا اپنا مزاج

ہندوستان کی قدیم رسموں، رواجوں، طرزِ زندگی، آب و ہوا جغرافیائی حالات، سرد گرم موسموں نے بھی اردو کو فارسی سے الگ الگ رکھا۔ اردو نے فارسی کے سائے میں سفر شروع کیا مگر وہ اس کے باوجود فارسی کے اثر سے خاطر خواہ دور رہی۔ اس نے بعض مقامات پر فارسی سے افہام و تفہیم کیا، مگر اکثر مقامات پر اس کے ساتھ ساتھ ملانے سے بھی انکار کر دیا۔ کئی جگہوں پر فارسی کے محاوروں کو اپنے خاص انداز سے ڈھال لیا۔ یہاں کی رسموں مذاہب اور دیو مالا نے ایک ایسی اردو شاعری اور نثر کو جنم دیا۔ جسے ہم کسی طرح سے بھی فارسی کا عکس نہیں کہہ سکتے۔ اردو کا ذاتی مزاج بہرحال اس پر غالب رہا اور اس نے اپنے رنگ کو ہر حالت میں برقرار رکھا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ ہمارے شاعر حضرات وہی باتیں کہتے اور وہی فکر کرتے جو صدیوں پہلے ایک زوال پذیر معاشرے میں سوچی گئی تھی اور جو ایک تاریخی عمل کے زوال کا نتیجہ تھی۔ جس وقت فارسی خیال اور لہجہ ہندوستان میں آیا تو اس وقت ہندوستان میں شاعرانہ خیالات ایک نئی فضا میں پرورش پا رہے تھے اور ایک نئے تجربے سے ہمکنار ہو رہے تھے۔ عشق و محبت کی واردات کا ایک ہونا کوئی ایسی بات نہیں ہے یہ مضامین کم و بیش فرق کے ساتھ تقریباً دنیا کی ہر شاعری میں ایک ہی انداز میں باندھے گئے ہیں۔ حقیقت اس امر کی غماز ہے کہ اردو کا مزاج فارسی سے بالکل الگ رہا۔ اس نے فارسی سے اثر ضرور لیا مگر اس کی غلامی کبھی قبول نہیں کی۔ اس حقیقت کے باوجود کہ اردو پر فارسی شاعری کی چھاپ صاف نظر آتی ہے اس کے باوجود اردو کی انفرادیت اور مزاج کا انوکھا پن اپنی جگہ پر قائم ہے۔

"آبِ حیات" میں محمد حسین آزاد نے شاہ نصیر کی کچھ غزلیں نقل کی ہیں جو ہمارے اس دعوے کی تائید کرتی ہیں کہ اس دور میں بھی اردو نے فارسی سے اپنے مزاج کا دامن الگ رکھا۔ شاہ نصیر کی ایک غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

بادہ کشی کے سکھلاتے ہیں کیا ہی قرینے ساون بھادوں
کیفیت سے ہم نے جو دیکھا دو ہیں مہینے ساون کے
تا نکلنے کو پھرتی ہے بجلی اس میں گوٹ تمامی کی
دامن ابر کے ٹکڑوں کو جب لگتے ہیں سینے ساون بھادوں
بھولے دم کی آمد و شد ہم یاد کر اس جھولے کی پینگیں
سوجھے ہے بے یار نہ دیں گے آہ یہ جینے ساون بھادوں
کیوں نہ یہ دُر ہائے تگرگ ہے بادہ پہ تو برسائیں
کان گہر چھٹ زر کے رکھتے ہیں گنجینے ساون بھادوں
کاں جواہر کیونکر دیکھے کھیت کو دہقان اولوں سے
برسانے ہیں موتیوں میں ہیرے کے نگینے ساون بھادوں
ابر سیاہ میں دیکھی تھی بگلوں کی قطار اس شکل سے ہم نے
یاد دلائے پھر کے تیرے دندان مِسّی نے ساون بھادوں

شاہ نصیر کی اس غزل میں ہو سکتا ہے معنویت یا بلندی خیال نظر نہ آئے مگر اردو فارسی کا ایک نمایاں فرق ضرور دکھائی دے گا۔ ہمیں یہ ثبوت ضرور مل جائے گا کہ فارسی کے طوفانوں میں بھی اردو نے اپنا منفرد انداز اور مزاج برقرار رکھا۔ اردو کی انفرادیت اور آزادی کی مثال کے لیے ہم شاہ نصیر کی اوپر والی غزل سے ساون بھادوں جھولے کی پینگیں وغیرہ کی مثالیں اردو کے خاص مزاج کے سلسلے میں بے دریغ دے سکتے ہیں۔ اردو نے آخر میں ایک اور کام کیا اور وہ یہ کہ اپنی تحویل میں لا کر عربی اور فارسی کے بے شمار الفاظ کے معنی ہی تبدیل کر دیے۔ مثال کے طور پر۔ تماشا، ماجرا اسباب (یعنی سامان)، عدالت (کچہری) اس سے یہ بھی ثبوت ملتا ہے کہ اردو زبان ایک آزاد ماحول میں پرورش پا رہی تھی اور انقلابی عمل میں سے گزرتے ہوئے اس نے اپنے علمِ آزادی کو بلند کیے رکھا۔ اردو نے عربی، فارسی، انگریزی اور سنسکرت کے کئی ایک الفاظ کے معنی ہی بدل ڈالے۔ مثلاً ذیل کے چند الفاظ دیکھیں کہ ان کے اپنی زبان میں معنی الگ ہیں مگر اردو میں آ کر ان کے معنی بالکل بدل گئے ہیں۔

قطعاً عربی میں کاٹ کر کہتے ہیں۔ مگر اردو میں اسے ہرگز کہتے ہیں۔ اعتراض کو عربی میں آگے جانا۔ چھیل جانا کہتے ہیں مگر اردو میں نکتہ چینی کرنے کو کہتے ہیں۔ مقدمہ کو عربی میں آگے کیا ہوا کہتے ہیں اور اردو میں وہ جھگڑے کے معنی میں ہے جو عدالت میں پیش ہو۔ متانت کو عربی میں بھاری ہونا کہتے ہیں لیکن اردو میں اسے مہذب ہونا کہا گیا۔ میزان کو عربی میں ترازو کہتے ہیں مگر اردو میں یہ جمع کے معنوں میں بھی استعمال کیا جاتا ہے محاذ کو عربی میں مقابل کہتے ہیں مگر اردو میں لڑائی کا میدان کہا گیا۔ شکل کو عربی میں مثل یا مشابہ کہتے ہیں۔ اردو میں اسے صورت کہا گیا۔ تعمیر عربی میں آباد کرنے کو کہتے ہیں اردو میں اسے عمارت بنانا کہتے ہیں۔ ضبط عربی میں نگاہ رکھنا کو کہتے ہیں لیکن اردو میں آ کر اس کے معنی ہو گئے چھین لینا۔ ضبط کر لینا ضابطہ عربی میں نگاہ رکھنے والے کو کہتے ہیں لیکن اردو میں اسے قاعدہ کہا گیا۔ عربی میں تقریر کے معنی ہیں ثابت کرنا۔ اردو میں تقریر کرنا بن گئے۔ اسی طرح ادبار کے معنی عربی میں ہیں پیچھے ہونا۔ لیکن اردو میں اس کے

معنی زوال پذیر ہوتا بن گئے۔ یہ مثالیں ہم نے سید سلیمان ندوی کی کتاب نقوش سلیمانی سے لی ہیں۔

اردو پر عربی کے احسانات

اگر ہم تاریخ کا بہ نظر غائر مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ہندوستان کے ساتھ عربوں کے تعلقات ظہور اسلام سے بہت پہلے قائم ہو چکے تھے۔ اس وقت ہندوستان کا مطلب سندھ کی وادی تھا یا زیادہ سے زیادہ گجرات کاٹھیاوار کا ساحل جسے مالابار یا کرناٹک کا ساحل کہا جاتا تھا۔ ہند کا مطلب ہی یہ تھا کہ وہ آدمی جو سندھ کی وادی میں رہتا ہو۔ یہ لفظ سندھو تھا جو بگڑ کر ہندو ہو گیا۔ بعد میں عرب فاتحانہ حیثیت سے ہندوستان میں آ گئے۔ اس وقت وہ اپنے ساتھ دین اسلام کا ایک ترقی پسند، انسانیت نواز، انسانیت پرست انقلابی نظریہ لائے جس میں کسی انسان کو دوسرے انسان پر مادی یا مالی برتری حاصل نہیں تھی۔ یہ ایک صحت مند اور انسانی معاشرے کی بزرگی اور عظمت کے لیے ایک نیا پیغام تھا۔ ہندوستان کے لوگوں پر جو کہ ذات پات کے بندھنوں میں بری طرح جکڑے ہوئے تھے اس انسانیت نواز دین کا بڑا نمایاں اثر ہونے لگا۔ اس کے علاوہ جو سلطان یہاں وارد ہوئے۔ ان کی اپنی زندگیاں اخلاق اعلیٰ کا جیتا جاگتا نمونہ تھیں۔ لوگ ان کی عملی زندگیوں اور ان کے بہترین اخلاق سے بھی متاثر ہوئے۔ اسلام کی روشنی اس برصغیر کے اندھیروں میں چاند اور سورج بن کر چمکی۔ اسلام کا اجالا جب ایران میں پھیلا تو اس کی دوشن کرنیں ہندوستان پر بھی پڑیں۔ ہندوستان میں اسلام کی آمد کے بعد یہاں عربی زبان نے اردو پر اپنا اثر ڈالنا شروع کر دیا۔ اس سے بہت پہلے مالابار اور کرناٹک کے ساحلوں پر عربوں کے تجارتی جہاز آ کر ٹھہرا کرتے تھے۔ عرب تاجر اپنے ساتھ عربی زبان لائے تھے۔ پھر مسلمانوں کے تجارتی جہاز وہاں آ کر رکنے لگے۔ مسلمانوں نے اپنے اخلاق سے جنوبی ہند کے غیر مسلموں کو بہت متاثر کیا۔ پھر صوفیائے کرام نے یہاں آ کر تبلیغ شروع کی اور یہاں اسلام کی روشن کرنیں پھیلنے لگیں۔ عربی نے بھاشا زبان پر اثر انداز ہونا شروع کر دیا۔

اس سے پہلے فارسی زبان نے اردو زبان کو ایک خاص شکل دے رکھی تھی۔ بھاشا اور اردو نے فارسی کے الفاظ اور تلمیحات کو قبول بھی کیا تھا اور اپنی مرضی کے مطابق ڈھال بھی لیا تھا۔ اب عربی اردو پر اثر انداز ہونا شروع ہوئی۔ مسلمان عربوں کو اس بات کا یقین تھا کہ عربی زبان اپنے قواعد، گرامر اور بلاغت کے اعتبار سے دنیا کی مکمل ترین زبان ہے۔ کوئی زبان حسن معنی اور وسعت معنی کے لحاظ سے عربی زبان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ پس وہ اس اصول پر بڑی سختی سے کار فرما تھے کہ اسلام کا پیغام سوائے عربی کے اور کسی زبان میں ادا نہیں ہو سکتا۔ دوسرے یہ کہ اسلام کے جو ارکان خاص ہیں۔ ان کی ادائیگی عربی میں ہی ہونی چاہیئے۔ علاوہ ازیں اس میں مسلمانوں کو ایک مرکز پر جمع کرنے کی مصلحت بھی پوشیدہ تھی۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اذان۔ نماز صرف عربی میں ہی ادا ہوتی ہے۔ قرآن بھی عربی زبان میں ہی پڑھا جاتا ہے۔ کلمہ طیبہ بھی عربی ہی میں پڑھا جاتا ہے۔ یوں عربی زبان نے ایک حتمی شکل اختیار کر لی تھی۔ عربوں کے پاس یوں بھی ایک دین تھا جو دین اسلام تھا اور مکمل ترین دین تھا۔ اس دین نے انسانوں کو اخلاق اعلیٰ کا ایک مکمل ترین ضابطہ دیا تھا۔ اہل عرب کو بجا طور پر اس پر ناز تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سیاسیات، اخلاقیات اور دین کے معاملے میں ساری دنیا میں چشمہ و منبع ہمیشہ سرزمین عرب ہی رہی ہے۔ اہل ایران نے بھی عربوں ہی سے اخلاقی اور سیاسی ضابطہ لیا اور ادب میں بھی عربی ادب کی خوشہ چینی کی جسے بعد میں اردو میں منتقل کر دیا گیا۔ تصوف کے بارے میں یا دینی تشریحات کے بارے میں جو کچھ بھی دنیا میں لکھا گیا وہ عربوں ہی کے حوالے سے باہر پہنچا۔ اس سلسلے میں دوسری زبانوں نے عربی زبان کی ترجمانی کے فرائض ضرور سر انجام دیے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر محمود حسین اپنی کتاب "مذہب اور شاعری" میں لکھتے ہیں۔

"۔ تبلیغ و تحریک کے معاملے میں عربی زبان کی نمایاں حیثیت رہی۔ چنانچہ مذہبی منقولات ہم کو فارسی زبان سے ملے اگر ذرا غور سے دیکھیے تو ان کی تہہ میں بھی عربی زبان و عربوں کے خیالات نظر آئیں گے۔ یہ اور بات ہے کہ اردو ادب لسانی و تخیل و فنی لحاظ سے فارسی سے زیادہ متاثر ہوا۔ لیکن جہاں تک ایمان اور اخلاق کا تعلق ہے اس کا سرچشمہ عربی زبان ہی ہے۔ مذہب اور اخلاق نے جو ایک قابل قدر ضخیم ذخیرہ اردو ادب میں فراہم کیا اس کے لیے بنیادی لحاظ سے عربی زبان کے لیے ہمیں ممنون ہونا پڑتا ہے۔ اصول دین یا فروع دین کا ہر جزو عرب ہی میں پیدا ہوا اور عربی زبان کو بلا واسطہ یا بالواسطہ نصیب ہوا۔ نماز، حج، قیامت، عدالت، خمس، زکوٰۃ، توحید غرض کہ ہر ایک اہم اور غیر اہم مسئلہ پہلے عربی ہی زبان کے پیکر میں وجود پذیر ہوا تب کسی اور زبان کو میسر ہوا۔ اس لحاظ سے اگر ہم اردو ادب کا جائزہ لیں تو صاف معلوم ہوگا کہ سارے کا سارا ادبی مواد ہمارے پاس عربی سے ہی آیا۔ قرآن و حدیث کے مختلف مسائل اور اشارات کی تفسیر کر کے ہماری زبان نے علمی و ادبی راستوں کو آسانی سے پا لیا۔ اعتقادات کی ترجمانی اپنی زبان میں کرنا ایک مذہبی فریضہ تھا اس کے ادق مسائل پر غور کرنا اور لوگوں کے سامنے اس طرح پیش کرنا کہ مفہوم ذہن نشین ہو جائے، بجائے خود ذہنی ارتقا کے لیے زبردست امداد کی صورت تھی۔ جو لوگ مذہبی امور پر قلم اٹھاتے تھے اول تو خود دوسری زبانوں کے اور کم از کم عربی زبان کے عالم ہوتے تھے۔ ادب کی لطافتوں اور نزاکتوں سے واقف ہوتے تھے اور دوسرے اس موضوع پر بحث کرنے میں ایک وجدانی کیفیت محسوس کرتے تھے کیونکہ مذہب سے والہانہ وابستگی دنیا کی ہر لذت سے زیادہ مسرت پہنچاتی تھی۔ اس وجہ سے وہ نہایت فصیح و بلیغ اردو میں بھی لانے کی کوشش کرتے تھے اور دینی جذبات کو آسودہ کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ غور و فکر کے ساتھ سوچتے تھے اور آسان سے آسان طریقہ پر لوگوں کے سامنے پیش کرتے تھے۔ نتیجہ ظاہر ہے یعنی اردو میں عمدہ الفاظ و خیالات کی کمی برابر پوری ہوتی رہی اور طرز تخیل کو بلند ہونے کے برابر سہارا ملتا رہا اور ایک ایسی صلاحیت پیدا ہو گئی جس کا کسی اور طرح سے وجود میں آنا آسان نہ تھا۔ اس لیے کہ اس کی ادبیات سے پڑھنے والے اور لکھنے والے دونوں یکساں دلچسپی لے سکتے تھے۔ مذہبی جذبات طرفین کو منہمک کر لیتے تھے یہاں کی مشترکہ دلچسپی نے جتنی ہمہ گیری اس طرح سے پیدا کر دی وہ کسی اور طرح ابتدائی عہد میں اردو نہیں پیدا کر سکتی تھی۔ عربی زبان ہی کا اثر تھا کہ اردو میں صوفیانہ خیالات کی بھرمار ہو گئی ہندوستان میں اسلام اور اس کے علوم کی اشاعت سے قبل ممالک اسلام میں لوگوں نے فلسفیانہ انداز سے مناد بنا، وحدت و کثرت وغیرہ کے مسائل پر غور کرنا شروع کر دیا تھا جو رفتہ رفتہ دوسری قوموں اور فلسفیوں سے

مل کر وسیع تر ہونے لگے۔ مگر اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ بنیاد عرب ہی میں پڑ چکی تھی۔ قرآن و حدیث کو بعض لوگوں نے اس طرح سوچا کہ ایک نئی تخیل پیدا ہو گئی اور اپنے طرزِ تخیل کو طاقت پہنچانے کے لیے ایسے مفہوم بتائے گئے کہ تصوف کے لیے توکل رضا و فنا و بقا وغیرہ کے مسائل تیار ہو گئے اور آگے چل کر عربی اور فارسی اردو ادب کے لیے نہایت اہم مرکز بن گئے" اور اردو کو ایک نیا میدان مل گیا"۔

آئینہ معروف کے مصنف نے بھی اپنی کتاب میں اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے اس کے خیال میں بھی مسلمانوں کے لیے عرب ہی وہ سرزمین تھی جہاں سے دینِ مبین کے علاوہ اخلاقِ اعلیٰ کے چشمے پھوٹے تھے۔ وہ لکھتا ہے۔

"یہ عرب ہی کی سرزمین تھی جہاں ہادیِ اکبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں تشریف لائے اور آپ نے انسانیت کو ایک مکمل دین اور ضابطہ اخلاق دیا۔ اسی سرزمین نے آپ کی بدولت اور آپ کے اسوہ حسنہ سے غریبوں سے ہمدردی کرنا، یتیموں سے پیار کرنا، مسکینوں کا پاس خاطر کرنا، ہمیشہ سچ بولنا، ہمسائی کا خیال رکھنا، گناہ سے بچنا اور خیالات کو اپنے اللہ کی طرف رجوع رکھنا سیکھا، اور پھر ساری دنیا کو اس اعلیٰ ترین اخلاق کا درس دیا۔ اس کی تعلیم اور تدریس بھی عربی زبان میں ہی ہوئی۔ دوسری دنیا تک جو کتب پہنچیں وہ بھی عربی زبان میں ہی تھیں جن کے بعد میں تراجم ہوئے۔ مگر عربی زبان نے ان زبانوں پر اپنے بعض الفاظ اور تراکیب کا گہرا اثر چھوڑا اور بعض الفاظ اور تراکیب جوں کی توں ان زبانوں میں منتقل ہو گئیں اسی طرح اخلاق کے میدان میں بھی فارسی ادب میں جو لٹریچر آیا وہ عربی ادب سے ہی آیا۔ اگرچہ اس کی شکل میں تھوڑی بہت تبدیلی کر دی گئی مگر اس کے معنی نہ بدل سکے۔"

اسلام نے ساری دنیا کے ادب اور زبانوں کو متاثر کیا لیکن اردو پر اس کا اثر براہِ راست بھی پڑا اور فارسی کے ذریعے بھی پڑا۔ فارسی نے عربی سے جو کچھ لیا تھا اسے جوں کا توں اردو والوں کے پاس لوٹا دیا۔ بلکہ اس میں کچھ اپنی طرف سے بیل بوٹے بھی بنا دیئے۔ تاریخِ اسلام اردو ادب کا ایک ناقابلِ تردید اور ناگزیر حصہ بن گئی۔ عرب کی سرزمین خاص طور پر مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے بارے میں اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں نعتیں لکھنا ہندوستان کے شاعروں کے لیے ہمیشہ سے باعثِ فخر بات رہی ہے۔ اس سلسلے میں بعض صنفِ ادب نے اتنی سربلندی حاصل کی کہ اس کی مثال دوسری زبانوں میں بہت کم ملتی ہے۔ مثال کے طور پر واقعہ کربلا کو لیجئے۔ مرثیے کے اردو ادب میں وہ بلند مقام حاصل کیا کہ آج تک وہ اسی مقام پہ فائز ہے۔ یوں دیگر واقعات تاریخِ اسلام کے واقعات اور کرداروں نے اردو زبان پر بے پناہ اثر کیا۔

اسلامی طرزِ معاشرت اور اُردو

اسلام اپنے ساتھ ایک ضابطہ اخلاق کے علاوہ ایک مکمل قانون بھی لایا تھا اس قانون نے انسانوں کو رہنے سہنے اور انسانیت کے احترام کا سبق دیا۔ ایک خاص طرز کی زندگی بسر کرنے کی تلقین کی جو بعد میں جا کر اسلامی کلچر کا ایک حصہ بن گئی۔ پانچوں وقت ایک جگہ جمع ہو کر نماز پڑھنا، ایک خاص سمت پاؤں کر کے نہ سونا۔ عید شبرات پر پکوان پکانا، حج، نماز، روزہ اور دین کے دوسرے ارکان نے مل کر مسلمانوں کو ایک ایسا کلچر دیا جس نے ہر جگہ مسلمانوں کو ایک ساتھ طرزِ معاشرت کی لڑی میں پرو دیا۔

اسی طرح کفن دفن اور نمازِ جنازہ کے بارے میں بھی سارے فرائض مشترک تھے۔ ان ارکان کی ادائیگی عربی زبان میں ہی ہوتی تھی۔ یہ عربی زبان کی جامعیت تھی کہ فارسی اور اردو میں بھی انہیں عربی میں ہی برقرار رکھا گیا۔ اگرچہ ان کے تراجم اردو میں بھی ہوئے مگر اسے عربی میں پڑھنا لوگ اپنے اوپر آج بھی فرض سمجھتے ہیں۔

ایمان کے اس جذبے کی وجہ سے عربی کے الفاظ بڑی روانی سے اردو زبان میں آنا شروع ہو گئے۔ اردو زبان پر عربی کے اثرات بے پایاں ہوئے اس میں جذبہ ایمانی سب سے زیادہ کارفرما رہا۔ برصغیر کے مسلمانوں نے اپنے بچوں کے نام عربی میں رکھنے شروع کیے۔ ان میں باری تعالیٰ کی صفات بھی تھیں اور نام کو کسی نہ کسی بزرگ سے منسوب بھی کیا گیا تھا۔ اس حقیقت سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ دین کا اثر بڑا گہرا اور دیرپا ہوتا ہے۔ عربی زبان اس اثر کے ساتھ اردو میں آئی اور آج ہم اردو کی بساط پر جگہ جگہ عربی کے گلہائے عقیدت کو مسکراتے دیکھ رہے ہیں۔ عربی کے بعض ایسے الفاظ جن کا تعلق ارکانِ دین یا تصوف کی خاص اصطلاحوں سے تھا وہ ہر خاص و عام کی زبان پر چڑھ گئے اور آج وہ لوگ بھی ان الفاظ کو بے تکلفی سے بولتے ہیں جو ان کے معنی سے پوری طرح باخبر نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر تعالی اللہ، قال اللہ، قال الرسول، رضائے الٰہی، راہِ سلوک، نفسِ امارہ، معرفت، قناعت، استغنا، صبر و توکل وغیرہ۔ اب ہم ان افکار کی طرف آتے ہیں جو عربی زبان کی وساطت سے اردو ادب اور شاعری میں آئے۔ یہ عرب و عجم کے افکار کا نچوڑ تھا۔ عربی کتابوں کے ترجمے ہو کر اردو میں منتقل ہوئے۔ یہ سرمایہ بڑا گراں بہا تھا عربی اثرات اور افکار جب عجم یعنی خاص طور پر ایران میں پہنچے تو وہاں کی سرزمین میں ان پہ بہت کام کیا گیا۔ پھر یہ سرمایہ اردو میں منتقل ہو گیا۔ برصغیر میں آ کر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ عربی اور فارسی زبانیں ایک دوسری میں گڈمڈ ہو گئیں۔ فارسی نے ساری گرامر خاص طور پر شاعری کے اوزان اور بحور عربی سے حاصل کیے اور اردو نے فارسی سے یہ قیمتی خزانہ لے کر اپنے دامن کو وسیع تر کیا۔

بعض اصحاب کا یہ خیال ہے کہ عربی زبان کے جو الفاظ اردو میں آتے ہیں وہ بڑے دقیق ہیں۔ جب کہ فارسی کے الفاظ بڑے سادہ ہیں۔ حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ عربی کے سارے الفاظ دقیق نہیں ہیں اور نہ ہی فارسی کے سارے الفاظ سادہ اور سلیس ہیں۔ بہرحال اردو زبان نے ان دونوں زبانوں سے بھرپور استفادہ کیا اور ان کے مشکل الفاظ کو اپنے اندر جذب کر لیا۔ فارسی نے اردو کو زیادہ سلاست اور سادگی دی۔ لیکن فارسی کے تعاون کے بغیر اردو کو آسان اور سادہ بیانی سے لکھنا مشکل ہے۔ سید انشا اللہ خان انشا کی مشہور کہانی "رانی کیتکی اور اودے بھان کی کہانی" اور آرزو لکھنوی کا کلام ایسی مثالیں ہیں کہ انھوں نے عربی زبان کا ایک لفظ بھی استعمال نہیں کیا اور ساری کی ساری کہانی لکھ دی غزل اور نظم لکھ دی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسی کہانیاں اور غزلیں لکھی تو جا سکتی ہیں جن میں عربی زبان کے الفاظ نہ ہوں مگر اس طرح سے ہم اردو زبان کو بلندیٔ فکر سے محروم کر دیں گے۔ کیونکہ عربی زبان ایک پُرمغز اور فکر کی دولت سے مالامال زبان ہے۔ کیونکہ کسی بھی زبان کی نشوونما بغیر بلندیٔ تخیل اور ارفع فکر کے ہرگز نہیں ہو سکتی۔ ہماری ساری اردو ادب کی تاریخ گواہ ہے کہ اردو نے اپنے ادبی اور فکری معیار کو بلند تر کرنے میں عربی اور فارسی زبانوں سے بہت فائدہ اٹھایا۔ علاوہ ازیں ہم اپنی روزمرہ بول چال میں عربی فارسی کے الفاظ اتنی کثرت اور

روانی سے بولتے ہیں کہ ہمارے لیے یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ ہم صبح سے شام تک کتنے الفاظ عربی کے بول گئے؟ بعض الفاظ ایسے ہیں جو بڑی آسانی سے ہماری روزمرہ زندگی کی مصروفیات میں آ گئے ہیں اور ہم ایک پل کے لیے ان کے عربی ہونے کا احساس کیے بغیر بے تکان بولتے چلے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر مذاق، تقدیر، مدح دکان، تدبیر، عجب، شوق، عزت، ادب، شکور، تمیز، منظور، معاملہ، معذرت، ذلت۔ نسخہ، محل، جناب، وزیر، عزت، لفافہ، ذلیل وغیرہ۔ ان کے ساتھ ساتھ وہ الفاظ بھی لاتعداد ہیں جو فارسی تراکیب کے ساتھ مل کر سامنے آئے جیسے کہ بے خبر، علوم نا آشنا صلح پسند، بے ایمان، نالائق، بے وفا، بے خبر اور بے وقوف وغیرہ۔

علم و حکمت، طب، فلسفہ، علم نجوم، جمالیات، ریاضیات اور دوسرے فنون لطیفہ میں بھی بعض اصطلاحیں اور تراکیب خالصتاً عربی زبان سے جوں کی توں آ گئیں اور ہم اسے دن میں کئی بار بے تکان بولتے ہیں۔ اس تمام تجزیے کے بعد ایک بات نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے کہ اس سارے عمل ردعمل کے سلسلے میں اردو زبان نے کسی جگہ بھی عصبیت سے کام نہیں لیا۔ اس نے اپنے دامن کو پھیلائے رکھا تاکہ اس میں رنگا رنگ کی زبانوں سے رنگ برنگ پھول گرتے رہیں اور وہ سمیٹ کر اپنے دامن کو سجاتی رہے۔ اس کے علاوہ عربی زبان میں بھی بڑی وسعت اور ہمہ گیری تھی۔ سب سے بڑی خوبی اس زبان میں یہ تھی کہ تھوڑے سے تھوڑے الفاظ کے ساتھ زیادہ سے زیادہ مفہوم ادا کیا جا سکتا تھا۔ یہ صلاحیت برج بھاشا اور فارسی زبانوں میں زیادہ نہیں تھی۔ عربی قواعد کے ابواب کی وجہ سے ایک ہی مادہ ذرا سی تبدیلی کے بعد فاعل سے مفعول اور ظرف سے اسم ظرف بن جاتا تھا۔

ایسے جس قسم کے الفاظ خواہ کتنے ہی دقیق کیوں نہ ہو جائیں لیکن سہ حرفی مادے سے یا دو حرفی مادے سے اس لفظ کی پہچان کی جا سکتی ہے یعنی ایک اعتبار سے دو لفظ اور اس کا مفہوم نظروں سے اوجھل نہیں ہوتا۔

عرب معاشرت اور اردو

اردو ایک نئی زبان تھی۔ جس وقت یہ زبان ہندوستان میں اپنے ارتقائی مراحل میں سے گزر رہی تھی تو مسلمان فاتحین کی وجہ سے اس کا تعارف ان زبانوں سے ہوا جو تاریخ کے انقلابات کے ایک شدید عمل میں سے گزر چکی تھیں —— جنہوں نے زمانے کے بہت تھپیڑے سہے تھے اور جو تجربات کی بھٹی میں پک کر کندن بن چکی تھیں۔ عربی اور فارسی کے پاس دینے کو بہت کچھ تھا جبکہ اردو کا مزاج ایسا تھا کہ وہ لینے کو تیار رہتی۔ اس لحاظ سے اردو کو سب سے زیادہ فائدہ عربی سے پہنچا۔ ایک تو اس وجہ سے بھی کہ عربی کے مصنف اور شاعر سب مسلمان تھے۔ دوسرے یہ کہ سرکاری درباری زبان بھی عربی یا فارسی تھی اور عوام کو اسی زبان کی برتری کو تسلیم کرنا تھا۔ انہیں اسی زبان میں آپس میں بول چال کرنی تھی۔ اسی زبان میں کاروبار کرنا تھا اس کے علاوہ عرب فاتحین زبان کے ساتھ ساتھ ایک خاص قسم کی طرز معاشرت بھی لائے تھے۔ اپنی تاریخ کے واقعات اور کردار بھی ساتھ لائے تھے۔ اس طرح سے عربی تلمیحات کا ایک بہت بڑا ذخیرہ اردو میں منتقل ہوتا چلا گیا۔ اردو زبان کا دامن وسیع سے وسیع تر ہو گیا اور اس کی معنی خیزی میں اضافہ ہو گیا۔ مثلاً بعض تلمیحات یہاں درج کی جا رہی ہیں جن کا تعلق عربی معاشرت اور عرب تہذیب و کلچر سے ہے۔ اصحاب کہف، خندق، ذوالفقار، شمس الدجیٰ، فاروق، بلال، شداد، نمرود، اسم اعظم اسمٰعیل، اصحاب فیل، یوسف زلیخا، بیت الحزن، تابوت موسیٰ، سعد و سلمیٰ، حجر اسود حاتم طائی، سرمد، طوبیٰ، قیس و لیلیٰ، ہاروت ماروت، حسینؓ، یزید، شق القمر، اور دجلہ و فرات وغیرہ

عربی قواعد اور اردو

اس حقیقت سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ ہماری زبان کا رسم الخط عربی ہے اور اس زبان کے حروف تہجی کی بنیاد بھی عربی حروف ہیں، آپ کو الف سے ی تک پچانوے فیصد حروف عربی زبان کے ملیں گے۔ اگرچہ بعد میں بھاشا اور فارسی نے اپنا اثر ڈالا اور بعض حروف کی آوازیں بدل ڈالیں لیکن اس میں کسی قسم کے شک و شبہے کی گنجائش نہیں کہ اردو زبان کی ابتدا عربوں کے ہاتھوں ہوئی۔ کتاب الف با جو کہ یوسف بن محمد نے لکھی تھی اور مصر میں چھپی تھی میں لکھا ہے کہ عربی کے سارے حروف تہجی اردو میں منتقل ہوئے۔ ہاں البتہ اردو پر عربی صرف و نحو کا اثر واجبی سا ہے اسی طرح اردو کے واحد جمع اور تذکیر و تانیث بھی کسی نہ کسی طرح عربی قواعد سے بچ گئے۔ لیکن علاوہ صرف و نحو کے باقی سارے اردو کے علوم میں عربی کے پھریرے لہرا رہے ہیں۔ عربوں نے جو علوم اور قواعد مرتب کیے تھے۔ اہل ایران نے انہیں ویسے کے ویسے ہی اپنے ہاں استعمال کرنا شروع کر دیا۔ فارسی والوں سے اردو نے یہ خزانہ اپنے لیے حاصل کر لیا۔ اہل ایران نے بعض تبدیلیاں بھی کیں۔ لیکن اردو والوں نے ان تغیرات کو جائز نہ سمجھا اور براہ راست عربی سے متاثر ہو کر قواعد کی ساری عرب پابندیوں کو قبول کر لیا۔ اردو میں عربی محاوروں اور ضرب الامثال نے بھی بہت کام کیا۔ اردو زبان نے ان محاوروں اور ضرب الامثال سے پورا پورا استفادہ کیا۔ چند ایک عربی تراکیب درج ذیل ہیں۔

ذوی الاحترام، لیل و نہار، نعم البدل، مالک الرقاب، فی الفور، مخلوط الحواس، فی النار و السقر، خالی الذہن، بالغ نظر، بادی النظر وغیرہ۔

ہمیں فارسی اور عربی میں ایک بات مشترک نظر آتی ہے اور وہ ہیں بعض محاورے اور تراکیب اور کچھ تلمیحات۔ لیکن مجموعی طور پر اردو میں محاورے اور ضرب الامثال اور تلمیحات عربی کی نسبت فارسی سے زیادہ آئیں۔ اس کے باوجود عربی نے بلاواسطہ عربی سے اتنا استفادہ نہیں کیا جتنا کہ فارسی سے عربی سے کیا اردو نے سب کچھ فارسی کے واسطے اور رابطے سے لیا۔ اس اعتبار سے بعض ناقدین اور محققین کی رائے میں اردو پر عربی کی نسبت فارسی کے احسانات زیادہ ہیں —

ہندوستان میں آباد ایرانی النسل فارسی شاعروں نے جن کی مادری زبان بھی فارسی تھی۔ اپنے کلام میں فارسی کے علاوہ ہندوستانی رسم و رواج اور طرز معاشرت کو زیادہ اہمیت دی۔ ان پر ہندوستان کی فضا نے بھرپور اثر کیا اور انہوں نے اپنے شعروں اور اپنی کہانیوں میں ہندوستان کے واقعات اور تاریخی کرداروں کو جگہ دی۔ امیر خسروؒ نے دیول رانی خضر خان کے نام سے ایک مکمل مثنوی نظم کی۔ اس مثنوی میں ہمیں ہندوستان کی معاشرت میں استعمال ہونے والی عام اشیا کا بھی ذکر ملتا ہے اور ہندی لباس کا بھی۔

مسلمان کلچر اور اردو

مسلمانوں کی آمد کے ساتھ ہی برصغیر پاک و ہند میں عرب کلچر اور اسلام کے تہذیبی ٹھاٹے اس سرزمین کی قدیم تہذیب کے لیے ایک چیلنج بن گئے تھے۔ ہندوستان میں اس وقت ایک ایسا ہندو مت رائج تھا جس کی بنیاد چھوت چھات پر تھی جو انسانی مساوات کا قائل نہیں تھا۔ جس نے انسانوں کے درمیان مختلف گہری خلیجیں حائل کر رکھی تھیں۔ اسلام ایک

ترقی پسند اور انقلابی پیام لے کر آیا تھا۔ ایک ایسا پیغام جس میں مساوات تھی یہ ایک ایسی طرزِ معاشرت تھی جو سارے انسانوں کو ایک ہی صف میں کھڑے ہونے کا پیام دیتی تھی۔ علاوہ ازیں صوفیان کرام اور بزرگان دین نے اپنے نیک عمل سے لوگوں کو اس حد تک متاثر کیا کہ لوگ حلقہ بگوش اسلام ہونے لگے۔ اسلام کی روشنی ہندوستان میں پھیلتی چلی گئی۔

اسلام اپنے ساتھ جو طرزِ معاشرت اور کلچر و تہذیب لایا تھا۔ اس نے اب ہندوستانی کلچر اور تہذیب اور زبان پر اثر انداز ہونا شروع کر دیا۔ ہندوستانی فضا پہلے ہی ہندومت کے کدورات سے متاثر تھی۔ چنانچہ اسلام بڑی تیزی سے اپنی جگہ پیدا کرتا چلا گیا۔ اردو زبان نے عربی کا بے حد تیزی سے اثر قبول کیا۔ کسی ملک کی تہذیب اتنی جلدی دوسری تہذیب کے اثرات قبول نہیں کیا کرتی لیکن ہندوستان میں یہ تاریخی عمل بڑی جلدی شروع ہو گیا۔ اس کی بڑی وجہ ہندوؤں کا تعصب تھا عصبیت تھی اور غیر ہندوؤں کے ساتھ غیر انسانی سلوک تھا جو انہوں نے شروع ہی سے روا رکھا ہوا تھا۔ حالانکہ معاشرت ایک دم سے نہیں بدل جایا کرتی، کھانا پینا، رہنا سہنا، مزاج ان سب چیزوں کا تعلق اتنا گہرا ہوتا ہے کہ یہ نقش اترتے اترتے ہی اترتا ہے۔ ہر ملک کا اپنا اپنا لباس ہوتا ہے اور اپنا اپنا طرزِ زندگی ہوتا ہے تاریخ میں یہ عمل بڑی کاسست روی سے شروع ہوا کرتا ہے لیکن ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے تھوڑی ہی دیر بعد یہاں کے نومسلموں نے اسلام کے کلچر اور تہذیب کو بڑی تیزی سے قبول کرنا شروع کر دیا۔

اس کے باوجود یہاں کے دوسرے مذاہب نے بڑا زبردست محاذ کھڑا کر دیا۔ وہ ہندو جو نئے نئے مسلمان ہوئے تھے وہ اپنی طرزِ معاشرت پر اڑ گئے وہ اپنی زندگی کا سانچہ وہی رکھنا چاہتے تھے جو اسلام قبول کرنے سے پہلے تھا۔ چنانچہ شروع شروع میں یہاں کے ہندو جو مسلمان ہو گئے تھے۔ اسی پرانے لباس میں نظر آتے تھے۔ یوں ہندوستان کے مسلمانوں اور ہندوؤں کے لباس میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا تھا۔ لیکن دوسری طرف زبان کا عمل جاری تھا۔ اردو زبان نے عربی کا اثر بڑی سرعت سے قبول کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس کی سب سے بڑی اور اہم وجہ یہ تھی کہ سرکاری اور درباری زبان فارسی تھی جس پر عربی کا شدید اثر تھا۔ حکومت مسلمانوں کی تھی اور تصنیف و تالیف کا سارا کام فارسی میں ہوتا تھا جو عربی کے سائے میں پرورش پا رہی تھی۔

چونکہ زبان کا کسی ملک کے طرزِ معاشرت اور رہن سہن کے انداز سے بڑا گہرا تعلق ہوتا ہے اس لیے ہندوستان میں بھی دوسرے مذاہب کی شدید رکاوٹ کے باوجود اسلامی کلچر اور تہذیب نے اردو کے ذریعے یہاں اپنا اثر جمانا شروع کر دیا یہ تاریخی عمل اندر ہی اندر اس قدر سرعت اور اتنے پُراسرار طریقے سے جاری رہا کہ تھوڑے ہی عرصے میں یہاں مسلمانوں کی طرزِ معاشرت نے ایک نمایاں جگہ حاصل کر لی۔ دوسری طرف آب و ہوا نے بھی بہت کام کیا۔ ہندوستان کی آب و ہوا گرم تھی۔ چنانچہ یہاں آ کر مسلمانوں نے بھی بھاری بھرکم لباس اتار دیا اور ہلکا پھلکا پہناوا استعمال کرنے لگے۔ یوں ایک ملے جلے کلچر اور تہذیب نے جنم لیا جس میں اسلامی چھاپ بہرحال نمایاں تھی کیونکہ زبان کے ذریعے اسلامی عقائد اور اسلامی طرزِ معاشرت معاشرے کے دل میں جاگزیں ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر محمد حسین لکھتے ہیں۔

> "مسلمانوں کی آمد سے ایک سماجی انقلاب یہ ہوا کہ اب تک جو برہمنوں کو عوام پر تفوق حاصل تھا وہ نہ رہا۔ وہ بھی سب کے برابر سمجھے جانے لگے جو لوگ اس سے پہلے شودر یا اچھوت خیال کئے جاتے تھے وہ بھی دوسروں کے قریب تر ہو گئے۔ اس مساوات کا اثر یہ ہوا کہ اچھوت ذات زیادہ حلقہ بگوش اسلام ہونے لگے۔ اس کا سماجی نقطۂ نظر سے ذیل نتیجہ۔ جاٹ اور یہ دیکھ کر ہندوؤں نے بھی اچھوتوں کو پہلے سے زیادہ مراعات دینی شروع کر دیں۔ مغلیہ عہد حکومت سے پہلے کا زمانہ یعنی دلی سلطنت کا دور ہندوستانی نئی تہذیب کا پیش خیمہ یا تعمیری دور تھا۔ اس دور میں شعوری یا غیر شعوری طور پر مسلمانوں کا کلچر ہندوؤں کے کلچر میں آہستہ آہستہ نفوذ کرنے لگا تھا۔"

مسلمانوں کے فنِ جنگ اور فوجی انتظام و انصرام سے ہندو بے حد متاثر ہوئے ہندوستان میں مسلمانوں کے آنے اور فتوحات حاصل کرنے کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ چھوٹی چھوٹی ریاستیں بالکل ہی ختم ہو گئیں یہ ریاستیں ہند و تہذیب و کلچر کا گڑھ تھیں۔ ان کے ختم ہونے کے ساتھ ہی وہاں اسلامی کلچر کے لئے اپنے آپ راہ پیدا ہو گئی اور مسلمانوں نے ایک مرکز پر جمع ہو کر علم و فن کے میدان میں یکسوئی کے ساتھ آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ یہ ایک سکون، و اطمینان کا دور تھا جس میں مسلمانوں نے علم و ادب اور زبان پر بے پناہ کام کیا۔ صوفیائے کرام کی تبلیغ کے ذریعے اسلامی کلچر مقامی تہذیب میں نفوذ کرتا چلا گیا۔ مسلمانوں کے ہاں ایک خاص جمالیات کا ورثہ تھا وہ اس سے پہلے غرناطہ اور الہمبرا کے دوسرے علاقوں میں اپنے علم و فن کا سکہ جما چکے تھے ہندوستان میں ذرا سکون ہوا۔ ریاستوں کی بغاوتیں اور یورشیں ختم ہوئیں تو انہوں نے اپنے جمالیاتی ذوق کو بروئے کار لا کر یہاں تعمیرات کا سلسلہ شروع کر دیا یہ اسلامی فنِ تعمیر کا نادر شاہکار تھیں اور ان سے اسلامی طرزِ معاشرت کے سوتے پھوٹ رہے تھے۔

ہندوستان میں اسلامی تعمیرات کا سلسلہ قطب الدین ایبک کے زمانے سے شروع ہوا۔ اس کے بعد کے بادشاہوں نے بھی بڑی قابلِ ذکر اور قیمتی تاریخی عمارات بنوائیں فیروز شاہ تغلق نے اس سلسلے میں بہت کام کیا۔ اس کے آباد کئے ہوئے شہر فیروز آباد، فتح آباد اور حصار فیروزہ آج بھی آباد ہیں اور اس کا نام زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ یہ سلسلہ چلتا رہا۔ ایبک نے دہلی میں قطب مینار بنوایا۔ شہر میں متعدد نہریں بنوائیں۔ شہر کے مختلف حصوں کو خوبصورت اور گھنے سایہ دار درختوں سے آراستہ کیا۔ اس کے بعد جب مغل سلاطین آئے تو انہوں نے اس کام کو بہت آگے بڑھایا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ جو کام مغل دور سے پہلے کے مسلمان بادشاہوں نے شروع کیا تھا۔ اسے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ مغلوں نے عمارتوں کے علاوہ شہریوں کو باغات لگوانے اور نئے نئے درخت منگوانے پر بھی بہت توجہ دی۔ بے شمار درخت انہوں نے ایسے منگوائے جن کا وجود اس سے پہلے ہندوستان کی سرزمین میں کہیں نہیں ملتا۔ سرو کا درخت خالص مغل درخت ہے جسے بابر بادشاہ نے یہاں لگوایا۔ اس بارے میں امیر خسروؒ لکھتے ہیں۔

> ہندوستانی پھولوں میں چمپا، کیوڑہ، مولسری اور بیلا کے علاوہ کچھ ایسے پھول بھی تھے جن کو مسلمانوں نے فارسی نام دیے مثلاً گل کوزہ، گل صد برگ، قرنفل یا لونگ۔ اس فہرست میں مسلمان بادشاہ باہر سے درخت منگوا کر برابر اضافہ کرتے رہے، بنفشہ، یاسمین، نسرین وغیرہ کا سلسلہ برابر بڑھتا رہا اور مغل عہد تک ہزاروں قسم کے درخت ہندوستان میں آ چکے تھے۔"

بادشاہوں کے ذوقِ جمیل کو دیکھ کر امرا اور رؤسا نے بھی آگے بڑھ کر اپنی اپنی

حویلیوں کو باغات اور منزوں سے آراستہ کرنا شروع کر دیا۔ دہلی، آگرہ اور فتح پور سیکری مغلوں کے ذوق جمال کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔ تاج محل آج بھی ایک زندہ و پائندہ شاہکار بن کر آگرہ کی سرزمین میں قائم و دائم ہے۔ مسلمان سلاطین کی آمد سے پہلے ہندوستان میں علم کی اجارہ داری برہمنوں کے پاس تھی۔ برہمنوں کے علاوہ کسی کو علم حاصل کرنے کی اجازت نہ تھی۔ علم صرف برہمنوں کے بچے ہی حاصل کر سکتے تھے۔ مسلمانوں نے آکر اس اجارہ داری کو ختم کر دیا۔ مسلمان ایک وسیع اور کشادہ دل و دماغ لے کر آئے تھے۔ ان کے اسلامی نظریات کا دامن وسیع تھا وہ بھائی چارے اور مساوات کے حامی تھے۔ انہوں نے دوسرے لوگوں پر بھی علم و حکمت کے دروازے کھول دیے۔ سنسکرت اور دوسری ہندی زبانوں پر جو پہرے لگے تھے انہیں ختم کر دیا۔ خاص طور پر علم و حکمت اور ادب و فن کے سلسلے میں سنسکرت کی اجارہ داری کو توڑ کر رکھ دیا۔ مسلمانوں نے تعلیم عام کر دی۔ ہر کسی کو علم حاصل کرنے کی عام اجازت ہو گئی۔ اس تنگ نظری کے زبردست جہاد اور انقلاب نے معاشرے میں مسلمانوں کو ایک باعزت مقام عطا کر دیا اور غیر مسلموں نے بھی عربی اور فارسی زبان کو اپنانا شروع کر دیا۔ انہیں اب اس اردو سے کوئی جھجک نہ رہی تھی جس میں فارسی اور عربی کے الفاظ کی کثرت تھی۔

اس وقت حکومت کی درباری اور سرکاری زبان فارسی تھی۔ فارسی ہر کوئی پڑھنے لگا اور یوں ایک زبان کا علم اور حکمت دوسری زبان یعنی اردو میں منتقل ہونا شروع ہو گیا۔ اردو زبان و ادب کی یہ بھی بہت بڑی خوش قسمتی تھی کہ محمود غزنوی سے لے کر مغلیہ سلطنت کے آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر تک جتنے بھی مسلمان سلاطین گزرے ان سب میں علم دوستی اور ادب نوازی بدرجہ اتم موجود تھی وہ خود بھی علم حاصل کرتے تھے اور اس مقصد کے لئے باہر سے بڑے بڑے عالم فاضل حضرات کو ہندوستان میں بلوا کر انہیں بڑی بڑی جاگیریں دیتے تھے تاکہ وہ یہاں علم کی شمعیں روشن کریں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ سلاطین ہندوستان کی زبانوں کو بھی سیکھنے سے گریز نہ کرتے تھے۔ کئی مغلیہ شہزادے سنسکرت کے بڑے عالم تھے۔ ان میں دارا شکوہ اور خان خاناں کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اکبر کے عہد میں تو بے شمار سنسکرت کی کتابوں کے فارسی میں تراجم ہوئے جن میں رامائن، مہابھارت، اتھروید اور رگ وید خاص طور پر نمایاں ہیں۔ مشہور فارسی شاعر فیضی نے نل دمن کی مشہور ہندی کہانی کو فارسی میں ترجمہ کیا۔ اکبر بادشاہ کے ایما پر اس وقت کے فاضل اور ماہر لسانیات ملا عبدالقادر نے سنسکرت سے سنگھاسن بتیسی اور کتھا سرت ساگر کا ترجمہ فارسی میں کیا۔ اس تاریخی کام نے بھی اردو کو آگے بڑھنے میں بڑی مدد دی کیونکہ ان تمام کہانیوں کو عامۃ الناس تک اس وقت کی بھاشا زبان میں ہی پہنچایا گیا۔ لوگ اسی زبان میں یہ کتھا سنتے تھے۔ چنانچہ عربی فارسی کی ترکیبیں بڑی آسانی سے ان کی زبان پر چڑھتی چلی گئیں اور اردو میں جگہ پانے لگیں۔

مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد سے پہلے ہمیں یہاں کاغذ کے وجود کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ پرانے سنسکرت کے شاعر بھوج پتر پر اپنی نظمیں لکھا کرتے تھے۔ راجہ مہاراجہ بھی یا تو تانبے کی تختیوں پر اور یا بھوج پتر اور یا ہرن کے چمڑے پر احکام لکھوایا کرتے تھے۔ مسلمان فاتحین اپنے ساتھ کاغذ ایسی بیش قیمت شے بھی لے آئے تھے۔ کاغذ اس سرزمین میں پہلی بار آیا اور جب کتابیں اس کاغذ پر لکھی جانے لگیں تو یہاں ایک صحت مند انقلاب آ گیا۔ کتابیں دھڑا دھڑ فارسی اور عربی میں اور اردو میں لکھی جانے لگیں۔ اس کے نتیجے میں اردو زبان بڑی سرعت کے ساتھ آگے بڑھنے لگی۔ عربوں نے چینیوں کے بعد تاریخ میں پہلی مرتبہ جو کی نٹی اور کپاس کے پھول سے کاغذ بنانا شروع کیا تھا۔ یوں علوم شرقیہ کی اشاعت زوروں پر ہونے لگی۔ اب اسلامی طرز معاشرت نے ہندی طرز تہذیب پر اثر انداز ہونا شروع کر دیا۔ اس کلچر کی نمو سے ایک نئی زبان نے بھی سر اٹھانا شروع کر دیا۔ یہ نئی زبان وہ اردو تھی جس نے دوسری پراکرت بولیوں کا دامن چھوڑ کر اب فارسی سے لو لگائی تھی اور یوں بالواسطہ عربی طرز معاشرت اور اسلام سے برابر متاثر ہونے لگی تھی۔ یہ اردو کے ارتقائی دور کی نمایاں کڑی تھی۔

اس وقت ہندوستان میں کئی ایک زبانیں بولی جاتی تھیں۔ ان میں فارسی کے علاوہ سنسکرت بھی تھی اور کئی ایک دوسری بولیاں بھی تھیں۔ ان زبانوں میں سنسکرت اور دوسری ہندی بھاشاؤں کے بے شمار الفاظ آپس میں گڈمڈ ہو گئے تھے۔ مسلمانوں کی اشاعت علمی و ادبی کے بعد ان زبانوں کا بری طرح متاثر ہونا لازمی امر تھا چنانچہ لوگوں نے اب ایک ایسی زبان بولنی شروع کر دی جس میں فارسی اور عربی کے الفاظ کثرت سے استعمال کئے جانے لگے۔ ایسے ایسے عالم اور شاعر حضرات جنہیں عربی، فارسی اور سنسکرت پر پورا پورا عبور حاصل تھا۔ اس وقت آگے بڑھے اور انہوں نے قابل قدر خدمات سر انجام دیں۔ انہوں نے اردو زبان کو ایک خاص قسم کا مزاج، چاشنی اور لب و لہجہ عطا کیا۔ اس لب و لہجے میں ایران کی مہک بھی تھی اور عرب کی خوشبو بھی تھی۔ یہ علما بڑی آسانی سے عربی اور فارسی کے محاورات، تراکیب اور تلمیحات ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کر رہے تھے۔ چنانچہ اب ہم دیکھتے ہیں کہ بڑے بڑے ہندو عالم بھی فارسی اور عربی میں بولنا فخر سمجھتے تھے۔ اسی طرح وہ اس اردو کو لکھنا پسند کرتے تھے جس میں عربی اور فارسی لب و لہجہ کی شگفتگی تھی۔

اس نیک کام کو مسلمان بزرگان دین نے بھی آگے بڑھایا۔ ان کے درس و تدریس اور تبلیغ دین کا دائرہ بہت وسیع تھا وہ عام طور پر اس عہد کی ہندی بھاشا یا اردو ہی میں درس دیا کرتے اور تبلیغ کیا کرتے تھے۔ نصاب اگرچہ فارسی زبان میں تھا بعض کتابیں عربی زبان میں جوں کی توں پڑھائی جاتی تھیں لیکن ان کے مفہوم کو سمجھانے کے لیے یہ علما حضرات اردو زبان ہی کو وسیلہ اظہار بناتے تھے۔ اس لیے بھی کہ ان کا پیغام زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچ سکے اور زیادہ سے زیادہ لوگ اس سے استفادہ کر سکیں۔ ان بزرگان دین نے قصداً بھی اپنی تحریروں میں عربی اور فارسی کے الفاظ جا بجا رکھ دیے تاکہ ان کی زبان کو دینی طور پر بھی مالا مال کیا جائے۔ اس وقت ان بزرگان دین کے اس جہاد سے ثابت ہو گیا تھا کہ اب بھاشا میں اتنی طاقت اور اہلیت باقی نہیں رہی کہ اسلامی علوم و فنون کا بوجھ اپنے نازک کندھوں پر اٹھا سکے وقت کا تقاضا تھا کہ نئی زبان کو وسیلۂ اظہار بنایا جائے اور اسی اردو زبان میں علوم ظاہر اور تصوف کے مسائل کو قلمبند کیا جائے۔ پس ایسا ہی ہوا اور اردو کا دامن مالا مال ہو گیا۔

اب ہم ایک بار پھر مسلمانوں کے فن تعمیر کی طرف آتے ہیں جس نے اردو زبان کے ابتدائی دور میں اس کی تشکیل نو پر بے حد اثر ڈالا۔ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں مغلوں کی آمد سے بہت پہلے ہی سے ہندوستان میں اسلامی تعمیرات کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ قطب مینار اور مسجد قوۃ الاسلام کی تعمیر ہو چکی تھی۔ ان کے بعد جو بادشاہ بھی آیا اس نے پہلے بادشاہ سے آگے بڑھنے کی کوشش کی۔ ایسی ایسی

اسلامی عمارتیں تعمیر کروائیں جو ہندوستان میں آج بھی اسلام کے عہد رفتہ کی اَن مٹ نشانیاں بن کر زندہ ہیں۔ شمالی ہندوستان کی مغل سلطنتوں کے علاوہ جنوبی ہند یعنی دکن میں بھی بہمنیوں اور قطب شاہیوں نے ایسی ایسی نادر تعمیرات بنوائیں کہ آج بھی انہیں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ تعمیر کے فن کو ایک شاعرانہ مزاج دیا گیا تھا۔ سارے کے سارے سلاطین اس فن میں بے حد دلچسپی لیتے تھے اور ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرتے تھے اس والہانہ لگاؤ کا یہ نتیجہ نکلا کہ ہندو فن تعمیر بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ تیرھویں صدی عیسوی کے بعد ہندوستان میں جو عمارت بھی وجود پذیر ہوئی اس میں ہمیں مغلیہ طرز تعمیر یا اسلامی طرز تعمیر کی جھلک نمایاں طور پر ملتی ہے۔

ہندوؤں کے ہاں دیواروں اور میناروں پر نقش گری اور بت گری کی اس قدر بہتات تھی کہ اصل موضوع غائب ہو گیا تھا اور جو حسن سادگی اور وسعت میں ہوتا ہے اس سے اس زمانے کا ہندو فن تعمیر محروم ہو چکا تھا۔ مسلمانوں نے اس فن کو بھی پھر سے زندہ کیا۔ ہندوؤں نے بعد میں جو عمارت بھی تعمیر کرائی وہ مغلوں کے طرز تعمیر سے متاثر ہو کر کرائی۔ جھکی ہوئی محرابوں کا رواج اس سے پہلے ہندوؤں کی تعمیرات میں بالکل دکھائی نہیں دیتا تھا۔ مگر مسلمانوں سے متاثر ہو کر بعد میں ہندوؤں نے بھی اپنی تعمیرات میں محرابوں کا استعمال عام کرنا شروع کر دیا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے پہلے عمارت کی کرسی کو اتنا بلند نہیں اٹھایا جاتا تھا۔ مسلمانوں نے یہاں آکر پہلی بار ایسی عمارتیں بنوائیں جن میں کرسی زمین سے کافی بلند رکھی گئی۔ اس طرز نے اسلامی تعمیرات کے فن کو تاریخ میں ایک نمایاں جگہ عطا کی۔

فورٹ ولیم کالج

کلکتے میں سرجان گلکرائسٹ نے فورٹ ولیم کالج قائم کیا جس کے وہ خود پہلے سربراہ بھی تھے۔ اس کالج میں اردو زبان میں دوسری زبانوں کے شہ پارے ترجمہ ہونا شروع ہوئے اور خود اردو زبان میں بھی تصنیف و تالیف کا کام بڑے وسیع پیمانے پر شروع ہوا۔ جان گلکرائسٹ نے اردو زبان کی ترقی کے لیے اردگرد کے علاقوں سے بڑے بڑے زباندانوں اور اہل قلم حضرات کو جمع کر کے فارسی، عربی اور سنسکرت کی بلند پایہ کتابوں کے تراجم کرنے پر مامور کیا۔ اویس احمد ادیب نے اپنی کتاب "تنقیدی مطالعے" مطبوعہ الہ آباد ہلسنگ ہاؤس (۱۹۴۵ء) میں جان گلکرائسٹ کی اس مہم کو ہندوستان میں انگریزی راج کو مستحکم کرنے کے اقدام پر محمول کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"حقیقت یہ ہے کہ جان گلکرائسٹ سے لے کر ولیم ہنٹر تک سب انگریز اپنے برادر وطن کی بھلائی کے لیے کوشاں تھے۔ وہ انگریزوں کی حکومت کو ہندوستان میں مستحکم بنانا چاہتے تھے اس وجہ سے ان کی ہر کوشش اور ہر سعی میں تنگ نظری اور خود غرضی پوشیدہ ہوتی تھی فورٹ ولیم کالج کے تمام اردو پروفیسروں کی مساعی جمیلہ اردو کو سلیس، سادہ اور عام فہم بنانے کی اس وجہ سے نہ تھی کہ وہ اردو کو ایک ایسے اسلوب کا حامل بنانا چاہتے تھے جو آئندہ اس کی ترویج و اشاعت کا باعث ہو بلکہ ان کی یہ کوشش اس خود غرضی پر محمول تھی۔ ان کے افسران جو یورپی زبانوں سے واقف ہوتے تھے۔ ہندوستان آکر ہندوستانی زبانوں سے واقفیت حاصل کیے بغیر کس طرح حکومت کے معاملات کو سنبھالتے ۔۔؟ یہ قومی تہذیب اور تمدن کا سوال نہ تھا۔ بلکہ ملک گیری کی ہوس تھی اور ہندوستان پر جکڑ بندھنوں کو مضبوط کرنے کے طریقے تھے۔ اگر سرجان گلکرائسٹ اس تحریک کا بانی نہ ہوتا تو انگریزوں کے ہندوستان میں بڑھتے ہوئے اقتدار کو زبردست ٹھیس لگتی اور وہ ہندوستان پر اس قدر جلد قابض نہ ہونے پاتے۔ یہ محض انگریزوں کو اس قابل بنانے کے لیے قائم کیا گیا تھا کہ وہ ہندوستان پر حکومت کرنے کے قابل ہو جائیں۔ کیا ایسٹ انڈیا کمپنی کے ان اغراض و مقاصد کو پیش نظر رکھ کر کوئی اردو داں یہ کہہ سکتا ہے کہ ان کی یہ تمام کوششیں اپنی فلاح اور بہبود کے لیے نہ تھیں؟ حقیقت یہ ہے کہ اس کالج کی بنیاد اہل ہند کے مفاد کے لیے نہیں رکھی گئی تھی۔ کالج کا قیام کمپنی کی حکومت اور ملک گیری کی فوری ضروریات کا تقاضا تھا۔ اگر جان گلکرائسٹ کی یہ تحریک اردو زبان و ادب کے طرز تحریر اور انداز بیان کی باگ ڈور سلاست کی طرف پھیر دینے کے لیے تھی تو ان کی یہ مساعی کالج کے ارباب حل و عقد تک ہی محدود کیوں تھی؟ انہوں نے اس تحریک کو کل ہندوستان میں رائج کرنے کی کوشش کیوں نہ کی؟ اس کی وجہ وہی تنگ نظری تھی۔ اس میں وسیع رہنمائی اور علمی سرپرستی کو قطعاً دخل نہ تھا۔ اس سلسلے میں یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ اگر فورٹ ولیم کالج کے علمبردار واقعی اردو زبان و ادب کی خدمت کا جذبہ رکھتے تھے تو ان میں اردو زبان و ادب کی مختلف اصناف کے تراجم اور تصنیف و تالیف کی طرف توجہ دینی ضروری تھی۔ برخلاف اس کے انہوں نے زیادہ تر طویل افسانوں، قصہ کہانیوں کی کتابوں کو اردو میں ترجمہ کرایا۔ اس کی تہہ میں بھی وہی ملک گیری کا خیال پوشیدہ تھا۔ کیونکہ ہندوستان کا افسانوی ادب عہد کے رسم و رواج اور تہذیب و تمدن کا مکمل آئینہ ہے۔ اس وقت سیاست کا تقاضا یہی تھا کہ ہندوستان کے اطوار زندگی، خیالات و احساسات کے علاوہ ان کی سیاسی، سماجی، مذہبی اور اخلاقی زندگی کے متعلق کل حالات معلوم کیے جائیں تاکہ انگریز افسران کے لیے وہ ہندوستانی زندگی کے سمجھنے میں معاون ثابت ہوں۔ ہمارے اہل قلم بڑے فخر کے ساتھ یہ تحریر کرتے ہیں کہ ایک انگلستان کے رہنے والے نے، جو ہندوستان میں ڈاکٹری کے فرائض انجام دینے کے لیے روانہ کیا گیا تھا، اردو زبان و ادب کی وہ بیش بہا خدمات انجام دیں کہ آج اردو ادب اس کے بار احسان سے دبا جا رہا ہے۔ اور اس وقت تصنیف و تالیف کا کام شروع کر دیا جبکہ اردو شمالی ہند میں محض تقریری اور کاروباری زبان تھی۔ مدح سرائی کا نقاب اٹھانے کے بعد یہ پتا چلتا ہے کہ یہ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی کسی مقصد کی تکمیل کے لیے تھا۔ اگر تصنیف و تالیف کی نوعیت اور صنف پر غور کیا جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ اس عہد میں زیادہ تر لغات اور قواعد مرتب کیے گئے جو انگریزوں کو اردو زبان سیکھنے میں بڑی مدد دیتے تھے اور آج بھی دے رہے ہیں۔ ایسی کتاب فورٹ ولیم کالج میں ضبط تحریر میں نہ آئی جو ہندوستانیوں کے لیے بھی مفید ہوتی۔ ڈاکٹر گلکرائسٹ کی پہلی تصنیف "انگریزی ہندوستانی لغت" ہے جو انگریزوں کو اردو سکھانے میں مدد دیتی ہے۔ ان کی دوسری تصنیف "ہندوستانی علم اللسان" ہے۔ اس میں اردو، انگریزی اور انگریزی اردو کا ایک طویل فرہنگ موجود ہے۔ "اردو کی صرف نحو" وہ کتاب ہے جو فورٹ ولیم کالج کے نصاب میں داخل تھی۔ "مشرقی زباندان" اس عہد کی بہت ہی مقبول کتاب تھی کیونکہ اس میں انگریزی اردو اور اردو انگریزی فرہنگ کے علاوہ ایک ایسا ضمیمہ بھی شریک کیا گیا ہے۔ جو اللسنِ جنگ کے ہندوستانی ناموں پر مشتمل ہے۔ ایک اور کتاب جس کا یہ نام "فارسی افعال" ہے میں افعال پر بحث کی گئی ہے اور فارسی کا انگریزی اور اردو کے مترادف افعال کی فہرست دی گئی ہے۔ "اجنبیوں کے لیے رہنمائے اردو" اس کتاب کو خاص

طور پر انگریز افسروں کو اردو زبان میں دسترس رکھنے کے لیے لکھا اور چھاپا گیا۔ صرف گلکرائسٹ ہی نہیں اس کالج کے دوسرے پروفیسروں مثلاً کپتان روبک اور کپتان ٹیلر نے بھی اردو اور انگریزی کی لغات ہی مرتب کی ہیں۔

اردو زبان و ادب کے اہل قلم کو سرجان گلکرائسٹ نے اس وجہ سے ہندوستان کے گوشے گوشے سے بلوا کر کلکتے میں جمع کیا تھا کہ اردو زبان کی خدمت کی جائے یہ خیال بھی محض غلامانہ ذہنیت کا نتیجہ ہے۔ سرجان گلکرائسٹ نہایت نباض اور سمجھدار اور زیرک انسان تھا۔ اس نے یہ اندازہ لگایا کہ وہ خود اور اس کے ماتحت انگریز پروفیسر اگر فارسی اور دوسرے مشرقی علوم کی کتابوں کا ترجمہ کریں گے تب کہیں مدت مدید میں چند کتابیں عالم وجود میں آئیں گی۔ اس لیے اس نے ہندوستان کے مختلف حصوں سے اردو کے عالموں کو بلوا کر وہاں جمع کیا اور ان سے وہ کام لیا جو خود اس کو اور اس کے دوسرے انگریز ساتھیوں کو کرنا چاہیے تھا۔ اگر وہ انگریز افسروں کو ہندوستان کی کاروباری زبان اردو کی طرف مائل کرتا تو ملکی معاملات میں وہ زیادہ وقت نہ صرف کرنے پاتا۔ دوسرے یہ کہ ان ملازمین کو ایسٹ انڈیا کمپنی کثیر تنخواہوں پر ملازم رکھ کر ہندوستان روانہ کرتی تھی۔ اس میں نقصان کا پہلو نکلتا تھا۔ اس وجہ سے ہندوستانی اہل قلم کو بلا کر کم سے کم تنخواہ پر ملازم رکھا گیا۔ یوں کمپنی کے اخراجات میں زبردست کمی کی گئی اس وقت زمانے کی گردش نے ادیبوں اور شاعروں کو پیس کر رکھ دیا ہوا تھا۔ چنانچہ شاعر اور ادیب اور اس وقت کے انشا پردازوں نے اس موقع کو غنیمت جانا۔ فورٹ ولیم کالج کے کارپردازوں نے اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ انھیں کم سے کم معاوضہ پر ملازم رکھا اور ان کا عہدہ پروفیسر کی بجائے محض ایک منشی رکھا۔ یہ انگریز پروفیسروں کی نگرانی میں کام کرتے تھے۔ یہ دیسی منشی درس و تدریس کے علاوہ تالیف و ترجمہ کا کام بھی انجام دیتے تھے۔ وہ لوگ جو ہندی کی خدمت کے لیے بلوائے گئے تھے انہیں پنڈت کا لقب دیا گیا۔ اس کالج کے قانون اس قدر سخت تھے کہ ان میں کوئی ذمے دار عہدہ کسی غیر عیسائی ہندوستانی کو نہیں دیا جاتا تھا۔ دین مسیحی کی اشاعت کے لیے بھی ان ہی لوگوں کو نشانہ بنایا گیا۔ ان ہی سے انجیل کا آسان اور عام فہم ترجمہ کرایا گیا۔ اور اس کی کثیر اشاعت کی مذہب کی تبلیغ کا ذریعہ بھی انھیں ہی بنایا گیا۔

فورٹ ولیم کالج کے ارباب حل و عقد کی جس قدر بھی تحریکیں تھیں وہ ساری کی ساری ملکی اور سیاسی ضروریات کے ماتحت تھیں۔ یہ ایک مدبر اور زیرک سیاست دان کا قاعدہ ہوتا ہے کہ وہ ملک و قوم کی آئندہ ضرورتوں کا خیال کر کے ہی ایسی پالیسی وضع کرتا ہے کہ رعایا خود بخود اس کی طرف رجوع ہو جائے۔ مگر اس میں بہر صورت حکومت وقت ہی کا فائدہ ہو۔ اطہر رضوی صاحب اپنے ایک مضمون میں یوں رقم فرماتے ہیں کہ

> "لارڈ ولزلی جب گورنر جنرل ہو کر ہندوستان آئے تو انہوں نے محسوس کیا کہ ہندوستان کی اصل زبان فارسی نہیں بلکہ ہندوستانی ہے اور یہ زبان ہندوستان بھر میں بولی اور سمجھی جاتی ہے"۔

گذارش ہے کہ لارڈ ویلزلی جس وقت ہندوستان آئے اس وقت ان سے پہلے چار گورنر جنرل مزید گذر چکے تھے۔ انہوں نے برابر یہ محسوس کیا کہ ہندوستان کی قومی اور ملکی زبان فارسی ہی ہے اور کچھ زمانے تک فارسی ہی رہے گی۔ چنانچہ سب سے پہلے گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز نے پہلی منظم کوشش کلکتہ کے انگریزی علاقے میں دیسی کالج قائم کرنے کی کی تھی۔ جس میں انگریز اور ہندوستانی دونوں طلبا تعلیم پاتے تھے مگر اس میں صرف فارسی زبان کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اردو کو اس کالج میں جگہ نہیں دی گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہندوستان کی قومی، ملکی اور عدالتی زبان اس وقت تک فارسی ہی تصور کی جاتی تھی۔ مگر وارن ہیسٹنگز کے زمانے ہی سے یہ سمجھا جا رہا تھا کہ وہ وقت قریب آ رہا ہے جب اردو ہندوستان کی عدالتی اور سرکاری زبان ہو جائے گی۔

یہی وجہ تھی کہ کمپنی کے ملازمین برابر ذاتی طور پر اردو کی نوشت و خواند میں مہارت حاصل کر رہے تھے خود سرجان گلکرائسٹ نے معمولی سے الاؤنس پر انگریز افسران کو اردو کی تعلیم دینا منظور کر لیا تھا۔ لارڈ ویلزلی نے اگر یہ سمجھا کہ ہندوستان کی آئندہ قومی، ملکی، کاروباری اور عدالتی زبان اردو ہوگی تو کوئی نئی اور عجوبہ بات نہ تھی۔ فورٹ ولیم کالج کی تحریک کے ذمہ دار گورنر جنرل لارڈ ویلزلی نہ تھے بلکہ جان گلکرائسٹ تھے۔ اس کالج کے قیام میں خود گلکرائسٹ کو زبردست فائدہ ہونے کی امید تھی۔ یہ فائدہ روپیہ پیسے اور کامیابی و کامرانی کی شکل میں حاصل ہوا اور جس کی بدولت ۱۸۰۴ء میں کالج کی خدمات سے سبکدوش ہو کر ۱۸۱۸ء میں کمپنی کے قائم شدہ ادارہ مشرقیہ میں اردو کے پروفیسر ہونے کی صورت میں بھی فائدہ ظاہر ہوا۔ اتنا ضرور ہوا کہ لارڈ ویلزلی نے اردو نوازی کے لیے نہیں بلکہ گھڑی گھڑی کی اور پل پل کی سیاسی ضرورتوں سے مجبور ہو کر ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹروں کو فورٹ ولیم کالج کے قیام کے لیے راضی کر لیا۔ حالانکہ ملک گیری کی ہوس کا کثیر صرفہ اس اجازت میں حائل ہوا مگر گورنر جنرل نے اپنی حکمتِ عملی سے کام لے کر اور اخراجات کی کمی کے ساتھ اس کالج کو جاری رکھا۔

ایک اور صاحب۔ فورٹ ولیم کالج کے جان گلکرالیسٹ کی مدح میں لکھتے ہیں کہ۔

> "اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ڈاکٹر جان گلکرالیسٹ نے اردو کے انشا پردازوں کی صحیح راہنمائی کی اور ان کو ایک ایسے راستے پر ڈال دیا جو منزل مقصود تک جاتا تھا۔"

اس عبارت کے دو حصے ہیں۔ پہلا انشا پردازوں کی رہنمائی کا تذکرہ کیا گیا ہے اور دوسرے حصے میں منزل مقصود تک پہنچانے والے راستے کا ذکر ہے۔ جہاں تک انشا پردازوں کی رہنمائی کا سوال ہے۔ جان گلکرالیسٹ نے اردو کے انشا پردازوں کی رہنمائی نہیں کی۔ رہنمائی اس وقت ہوتی ہے جبکہ کسی خاص ادبی مقصد کو سامنے رکھ کر کوئی مستقل کوشش کی جائے۔ جان گلکرالیسٹ نے کسی خاص ادبی مقصد کی تکمیل کے لیے کوشش نہیں کی اردو زبان کی خدمت بھی اس کا مقصد نہیں تھا۔ اردو زبان و ادب میں ایک نئے اسلوب اور مرکزی ادب پیدا کرنے کا خیال بھی اس کے دل و دماغ میں موجود نہیں تھا۔ یہ ایک اتفاقی امر تھا کہ اردو زبان سیکھنے اور اپنی قوم کو سکھا کر حکومت کرنے کے اطوار سکھانے کے سلسلے میں اردو میں ایک طرزِ تحریر رائج ہو گیا۔ اس کو جان گلکرالیسٹ کی شعوری کوشش یا خدمات کہنا صحیح نہیں ہے۔ اس لیے جان گلکرالیسٹ نے اردو کے انشا پردازوں کی رہنمائی نہیں کی بلکہ اس نے تنگ نظری کے ساتھ اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے ان کو ایک ایسے راستے پر ڈالنے کی کوشش کی جو ہر حالت اور ہر صورت سے اس کے اور اس کی قوم کے لیے مفید تھا۔ صحیح رہنمائی تو اس وقت ہوتی جبکہ وہ اردو کے انشا پردازوں کو کسی خاص تحریک کی طرف مائل کرتا۔ فورٹ ولیم کالج کے قائم کرنے میں جو اس کا مقصد پوشیدہ تھا وہ اس مبسوط کارروائی سے بخوبی واضح ہے جو خود سرجان گلکرالیسٹ کی تحریر کردہ اپیل

لائبریری کلکتہ میں موجود ہے۔ انہوں نے خود اس کالج کے قیام کی وجوہ بیان کر دی ہیں۔ ان کی موجودگی میں کسی مزید تاویل کی نہ ضرورت ہے نہ گنجائش ہی باقی ہے۔

جہاں تک منزل مقصود تک پہنچانے والے راستے کا تعلق ہے مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ سرجان گلکرائیسٹ نے کسی ادبی پروگرام یا ادبی تحریک کے ماتحت یہ راستہ تلاش نہ کیا تھا۔ جب راستے کا سوال پیدا ہوتا ہے تو ہمیں جان گلکرائیسٹ کی ادبی کوششوں اور تحریکوں کو اپنے پیش نظر رکھنا پڑتا ہے۔ ایک طرف تو اس نے اردو زبان و ادب کے انشا پردازوں کو جمع کیا اور انہیں اور ان کی ادبی کاوشوں کو چند نقرئی ٹکڑوں کے عوض خرید کر اپنے مقصد کی تکمیل کا ذریعہ بنتا ہے۔ ان میں میر امن، شیر علی افسوس، مظہر علی خان ولا، میر کاظم علی جوان، حیدر بخش حیدری، میر بہادر علی حسینی، مرزا علی لطف، خلیل علی خان اشک، شیخ حفیظ الدین، مرزا جان طپش، مولوی اکرام علی، میر عبداللہ مسکین، میر محمد الدین فیض اور مرزا محمد فطرت وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ چند ہندو اہل قلم بھی جوائے۔ ان میں منہالی چند لاہوری، منشی بینی نرائن جہاں، للولال جی اور سدل مصرا قابل ذکر ہیں۔ انگریزوں کی ہندوستان میں آمد سے پہلے یہاں اردو مختلف زبانوں سے پکاری جاتی تھی۔ کوئی اسے ہندی کہتا تھا۔ کوئی ہندوی کہتا تھا مگر ۱۸۰۷ء میں سرجان گلکرائیسٹ نے اسے ہندوستانی کا نام دیا۔ ایک طرف تو یہ تاجر سلطنت انگلیشیہ اپنی حکومت کی جڑیں مضبوط بنانا چاہتا تھا اور دوسری طرف اردو زبان و ادب کے اہل قلم کی ادبی اور علمی کاوشوں کے لیے مار آستین بنا رہنا چاہتا تھا۔

اس نے یعنی سرجان گلکرائیسٹ نے للولال جی اور سدل مصرا کو جو اردو لکھتے تھے ایسی زبان لکھنے پر مامور کیا جس میں سنسکرت کے الفاظ موجود ہوں چنانچہ ان دونوں نے ایک ایسی زبان لکھنا شروع کی جس میں سنسکرت کے الفاظ بے دریغ استعمال کئے گئے تھے۔ ایک طرف تو جان گلکرائسٹ کی یہ کوششیں ہوتی تھیں کہ اردو زبان و ادب کو آسان اور عام فہم بنایا جائے اور دوسری طرف یہ کہ ایک ایسی زبان بھی تیار کی جائے جس میں سنسکرت سے فیض حاصل کیا گیا ہو۔ اور جو آگے چل کر بذات خود ایک علیحدہ زبان بن جائے۔ اس طرح اس نے "تقسیم اور حکومت" کی حکمت عملی کو کامیاب بنایا۔ کل ہندوستان دو گروہوں میں تقسیم ہو گیا۔ ایک وہ جو سدل مصرا کا متعلق تھا اور دوسرا وہ جو میر امن کی کوششوں کا ممنون تھا۔ اس طرح سے اردو اور ہندی کے قضیئے کی بنیاد جان گلکرائسٹ نے فورٹ ولیم کالج میں ڈالی جو روز بروز اہم سے اہم تر ہوتا چلا گیا اور آج ایک نزاعی مسئلہ بن گیا ہے۔ کیونکہ کسی قوم کی زبان دراصل اس قوم کی تہذیب و تمدن کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اگر کسی قوم کو فنا کرنا ہو تو پہلے اس کی زبان اور اس کے ادب کے ذخیرے کو تباہ کر دیجیے۔ یہ دونوں قومیں دو زبانوں کو پروان چڑھانے میں کوشاں ہو گئیں اور نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں الگ الگ زبانوں کے ساتھ ساتھ الگ الگ تہذیب و تمدن کی حامل ہو گئیں۔

دوحۃ الابصار

اردو زبان اور ادب کے پرانے قصے اور کہانیاں اکثر و بیشتر فارسی زبان سے ترجمہ کئے گئے۔ جو تراجم شمالی ہندوستان میں ہوئے ان میں جو قصے زیادہ مشہور ہوئے ان میں آرائش محفل، گلزار دانش، مذہب عشق، باغ بہار اور دوحۃ الابصار زیادہ اہم ہیں دوحۃ الابصار کے بارے میں ایک جگہ ترقی پسند نقاد اور مشہور محقق اویس احمد لکھتے ہیں کہ اردو میں زیادہ تر قصے فارسی سے آئے اس کی وجہ یہ تھی کہ انشا پردازان اردو زبان و ادب اردو زبان کو زیادہ سے زیادہ امیر بنانا چاہتے تھے انہوں نے اور جن کتابوں کے ترجمے اس انداز میں کیے کہ تصنیف کی شان پیدا کر دی۔ جہاں چاہا قصے کو طول دے دیا اور جہاں چاہا ایجاز و اختصار کو پیش نظر رکھا۔

دوحۃ الابصار بھی بوستان خیال (جلد دوم) کا آزاد ترجمہ ہے یہ ظاہر ہے کہ ہر اردو جاننے والا شخص فارسی زبان پر حاوی نہیں ہوتا۔ ایسے اصحاب کے لیے یہ تراجم بہت زیادہ مفید ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان ترجموں کو پڑھ کر وہ بھی حظ اٹھا سکتے ہیں بوستان خیال جلد اول کا ترجمہ مرزا محمد عسکری نے کیا تھا اور وہ بھی منشی نول کشور، نول کشور پریس لکھنؤ کی استدعا پر چھپا تھا۔ نول کشور پریس کی ادبی خدمات کا اعتراف ہر شخص کو کرنا پڑے گا۔ منشی موصوف نے صرف اردو جاننے والے طبقہ کی مشکلات کا اندازہ کر کے مرزا عسکری سے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ بوستان خیال کا مکمل ترجمہ کردیں۔ چنانچہ مرزا صاحب نے اس زبردست کام کا بیڑا اٹھایا اور بوستان خیال جلد اول کا ترجمہ نہایت سلیس اور شیریں زبان میں کیا۔ جہاں ہر جس رنگ کو اختیار کیا انتہائی خوش اسلوبی سے ادا کیا۔ معشوق کا سراپا، طلسم کی نیرنگیاں، صبح و شام کی کیفیتیں۔ مختلف مناظر، کوہ و صحرا کی حالتیں، رزم و بزم کی ہو بہو تصویریں، بحر و بر کی مختلف صورتیں اپنے فطری انداز میں بیان کیں۔ تسلسل داستان کو ہر جگہ برقرار رکھا۔ اشعار کا استعمال نہایت مناسب طور پر کیا۔ بھرتی کے اشعار سے درگزر کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ عبارت نہایت دلچسپ ہے مطلب یہ ہے کہ لطف زبان اور نازک خیالوں میں آپ امن دہلوی سے بھی آگے نکل گئے ہیں۔

دوحۃ الابصار کا آغاز بھی اس پرانی طرز پر ہے یعنی اس کتاب کی ابتدا حمد سے ہوتی ہے جس میں خداوند عالم کی ذات پاک کی چند صفات کو بیان کر کے اپنی کتاب کو کامیاب اور مقبول عام و خواص دیکھنے کی خواہش ظاہر کی گئی ہے مسلمانوں میں عربی کا علم شاہانِ مغلیہ کے زمانے میں جس قدر تھا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں اس کی تائید یہ کتاب بھی کرتی ہے۔ اس میں جا بجا اور خاص طور پر حمد کے حصے میں نہ صرف عربی کے جملے استعمال کئے گئے ہیں بلکہ بیانات کی تائید میں پورے پورے عربی کے جملے بھی لکھے گئے ہیں۔ حمد کے بعد نعت ہے مگر وہ بھی حمد کے طرز کی حامل ہے۔ یہاں اس کی عبارت دقیق بھی ہو گئی ہے اور ایسی پیچیدگی اس میں موجود ہے کہ جو عموماً دیباچہ یا مقدمہ میں ہوا کرتی ہے۔

اس کتاب کی کہانی کے بارے میں لکھنا بیکار ہے کیونکہ اس کا پلاٹ مکمل نہیں ہے غیر مرتب طور پر واقعات بیان کئے گئے ہیں اور کردار اس قدر تعداد میں پیش کئے گئے ہیں کہ ان کو بیک وقت ذہن میں رکھنا بہت دشوار ہے۔ واقعات بھی مافوق العادت بیان کئے گئے ہیں۔ مگر یہ کوئی خامی نہیں۔ کیونکہ زمانے کی سوسائٹی کا یہی تقاضا تھا۔ واقعات کے انتخاب اور ان کی تلاش پر کچھ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ یہ کتاب "داستان امیر حمزہ" کے مقابلہ کے لیے لکھی گئی تھی۔ اس کی وجہ سے اسے لازمی طور پر زیادہ دلچسپ بنانے کی کوشش کی گئی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ مصنف اس میں کافی حد تک کامیاب ہوا ہے مگر ضخیم بنانے کے لیے اس میں بھرتی کے واقعات کا بھی اضافہ کیا گیا ہے۔ جن کا اکثر و بیشتر مقامات پر نہ تو کوئی اصل قصہ سے تعلق ہوتا ہے اور نہ کسی خاص کردار پر روشنی پڑتی ہے۔

اس کتاب کے قصے میں جو ذیلی واقعات بیان کئے گئے ہیں وہ صرف چند کے علاوہ

قصے کے لیے ضروری معاون ثابت ہوتے ہیں۔ مبالغہ اس میں غلو کی حد تک پہنچا ہوا ہے حقیقت سے کچھ بھی تعلق معلوم نہیں ہوتا۔ مگر جہاں تک معاشرے کے حالات کا تعلق ہے اس میں حقیقت کی جھلک ضرور پائی جاتی ہے۔ بوستان خیال اپنے وقت کی تہذیب و تمدن کے علاوہ اپنے معاشرے کا ہو بہو نقشہ اور تصویر پیش کرتی ہے۔ رزم اور بزم کے واقعات کے علاوہ کرداروں کی مردانہ حرکات اس زمانے کے نوجوانوں کی حالت کو پیش کرتی ہیں کہ وہ کس طرح مشکلات میں پھنس کر خوش ہوتے تھے اور اپنے پیدا کرنے والے پر بھروسہ کر کے خوش رہتے تھے۔ جہاں کہیں ان کو ایسی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا جن سے ان کی جان خطرے میں پڑ جاتی تھی تو ان کی مدد غیب سے ہوتی تھی کوئی نہ کوئی بزرگ ہستی ان کی مدد کے لیے ضرور وقت پر آ جاتی تھی۔ اس کتاب کی عبارت کا رنگ بھی پرانا اور مسجع ہے۔ رنگینی اور بناوٹ کو خاص طور پر ملحوظ رکھا گیا ہے۔ الفاظ ناپ تول کر استعمال کئے گئے ہیں مگر اس کتاب کی عبارت میں رنگینی کو اس قدر دخل نہیں کہ الفاظ کے گھروندے میں مرزا رجب علی بیگ سرور کی عبارت کی طرح اکثر موقعوں پر مطلب خبط ہو کر رہ جائے۔ عبارت کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔

> "خلاصۂ موجودات۔ ولاۂ کائنات، دافع مکر و حیلہ سازی رافع بازار، غدر و دغا بازی، شیرازہ جمعیت محبوب و دوستاں دین معیار حال دشمنان، شرح متین ناظم محاکم عدل و انصاف، ہادم مراسم، جور و اعتساف، مفتاح، مشکلات جگر بنی آدم مصباح، نخامۂ طلسمات، عالم مطلوب ارباب شریعت، مقصودِ اصحاب طریقت، انیس العالمین، شفیع المذنبین۔"

اس کے بارے میں یہ بات ضرور لکھنے والی ہے کہ اس میں عبارت آرائی اور مقفیٰ و مسجع طرز کو ملحوظ رکھنے کے لیے فارسی کے بڑے بڑے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جن کے لیے ڈکشنری درکار ہوتی ہے مگر جب ایک بار الفاظ کے معنی معلوم ہو جاتے ہیں۔ اس وقت اس کی عبارت کا لطف آتا ہے ورنہ یوں تو وہ ایک روکھا پھیکا الفاظ کا مجموعہ ہے۔ اسی وقت اس کی بلاغت کا لطف حاصل ہوتا ہے۔ کہانی کی دلچسپی اور بیان کی دل آویزی اس وقت ظاہر ہوتی ہے مگر جہاں پر سادگی زبان کو ملحوظ رکھا گیا ہے وہاں عبارت میں زیادہ دلکشی نہیں رہتی بلکہ الفاظ کی ترکیب بھی موزوں نہ ہو جاتی ہے۔ مثلاً:

> "اور ہم دونوں واسطے دیکھنے کے تماشہ روانہ ہوئے۔"

"ہاں اتنا ضرور ہے کہ جس چیز کا بیان دیا گیا ہے وہ مکمل ہے۔ قصے جو ذیلی طور پر بیان کئے گئے ہیں مکمل ضرور کر دیئے جاتے ہیں مگر ایک عرصہ انتظار کے بعد۔ اس کتاب کے اشخاص قصہ کے کرداری ارتقا کے لیے اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ عمرو اور عیار کے کردار سے اس کتاب کے کردار کو مختلف خصوصیات کا حامل دکھلایا گیا ہے۔ کردار اپنی ضروریات کے مطابق نہ صرف اپنی ساخت اور ظاہری پوشاک کو تبدیل کرتے رہتے ہیں بلکہ اپنے مذہب کو بھی بدلتے رہتے ہیں مگر کہیں اس کی کوئی وجہ بیان نہیں کی جاتی ہے بلکہ ایک بات زبان سے نکلی اِدھر اس پر عمل کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح یہ کردار کہیں تو پہلی ہی نظر میں عشق کے شکار ہو جاتے ہیں اور کہیں کوئی بات سن کر سفر کے لیے روانہ ہو جاتے ہیں۔

عورتوں کی گفتگو خاص طور پر ان کے فطری انداز میں لکھی گئی ہے۔ ان کی اصطلاحات، اور ان کی نسوانی زبان اور ان کا طرز خاص طور پر قابل دید ہے۔ ذیل کی عبارت سے یہ خصوصیات ظاہر ہیں۔

> "عزالہ نے کہا۔ بڑھاپے میں میرا سر مونڈا جانے لگا۔ ہائے میرے آگئے یہ کیا کارخانہ طلسم ہے کہ ملکہ کو غش آ گیا۔ کسی نے کہا یہ جگہ پر اسرار ہے۔ کوئی بولی نہیں ربی۔ اس امر کا کوئی نہیں واقف کار ہے۔ ایک نے کہا قرآن مجید کی ہوا دو۔ کسی نے کہا تھوڑا تھوڑا کیوڑہ اور بید مشک پلا دو۔ کوئی بولی۔ ملا سیانے کو بلا لو۔"

اتنا تو دوحۃ الابصار کے بارے میں تھا اب ذرا اس کتاب کے مترجم کے بارے میں بھی بیان ہو جائے۔ اس کتاب کے مترجم اور (مصنف کسی حد تک) میر تقی خیال تھے یہ گجرات کے رہنے والے تھے۔ زمانے کے ہاتھوں پریشان ہو کر دہلی پہنچے۔ جہاں ان کو ایک طوائف سے عشق تھا۔ اس کی فرمائش تھی کہ مجھے ہر روز ایک نیا قصہ سنایا جائے۔ چنانچہ میر تقی خیال ہر روز اس معشوقہ کو ایک نیا قصہ سناتے تھے اس کے مکان کے پچھواڑے ایک جلسہ ہوا کرتا تھا جس میں داستان امیر حمزہ روز پڑھی جاتی تھی۔ ایک روز میر تقی خیال بھی وہاں موجود تھے۔ جب جلسہ برخاست ہوا تو لوگوں نے اس کتاب کی تعریف کی اور اتنی تعریف کی کہ آپ کو ناگوار معلوم ہوئی اور آپ نے کہا کہ اس سے بھی بہتر کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔ چنانچہ خیال نے اس کتاب کو تحریر کر کے جلسہ میں پڑھا۔ یہ اس کتاب کی وجہ تصنیف تھی۔

گلکرائسٹ کی خدمات

یہ مئی ۱۸۰۰ عیسوی کا زمانہ تھا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان میں مستحکم ہو چکی تھی۔ اس زمانے میں لارڈ ویلزلی ہندوستان کا گورنر جنرل بن کر آیا۔ یہ ایک دور رس اور جہاندیدہ انگریز تھا اور اس کی نظر میں انگریزی اقتدار کو مستحکم تر بنانا تھا۔ اس کے حصول کے لیے اس نے سوچا کہ سب سے پہلے انگریزوں کو ہندوستان کی مروجہ زبانوں پر عبور حاصل کرنا بہت ضروری ہے۔ چنانچہ اس نے کلکتے میں اس مقصد کے حصول کے لیے فورٹ ولیم کالج کی بنیاد ڈالی۔ جان گلکرائسٹ ایک ڈاکٹر صاحب تھے جو ولایت کے شہر اڈنبرا سے یہاں طبابت کرنے آئے تھے یہ اردو زبان میں شد بد رکھتے تھے۔ آدمی ویلزلی کی طرح بہت زیرک اور بہت شدید قسم کے برطانیہ پرست انگریز تھے چنانچہ لارڈ ویلزلی نے سر جان گلکرائسٹ کو فورٹ ولیم کالج کا پرنسپل مقرر کر دیا۔

گلکرائسٹ نے جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے اطراف و اجانب سے اہل قلم اور اہل علم حضرات کو جمع کرنا شروع کر دیا۔ فورٹ ولیم کالج میں اس نے انگریز پروفیسر بھی مقرر کئے۔ ہندو اور مسلمان جتنے بھی اہل قلم حضرات کو ملازم رکھا انہیں ہر حالت میں انگریز پروفیسروں کی نگرانی میں رہ کر کام کرنا پڑتا تھا۔ اس کالج میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازموں کو باقاعدہ اردو کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ اس سے پہلے ہندوستان میں لارڈ وارن ہیسٹنگز کے زمانے میں ایک کالج قائم ہوا تھا جس کا نام دیسی کالج تھا۔ اس کالج میں انگریزوں کو فارسی پڑھائی جاتی تھی۔ یہاں انگریزوں کو اردو پڑھانے کا کوئی بندوبست نہ تھا۔ اس زمانے میں ہر انگریز ملازم کو ماہوار تیس روپے تنخواہ ملتی تھی۔ فارسی تو وہ پڑھ لیتے تھے مگر اردو میں اپنے طور پر اگر کسی نے شد بد حاصل کر لی تو کر لی ورنہ سرکاری طور پر اس کی تدریس کا کوئی انتظام نہ تھا۔ اس کی وجہ خاص یہ بھی تھی کہ اردو ان دنوں اپنے ابتدائی عہد میں تھی اور ابھی اسے ہندوستان میں مرکزی حیثیت حاصل نہیں ہوئی تھی۔ فارسی ہی اس وقت سرکاری زبان تھی۔ سارے کاروبار فارسی زبان میں ہوتے تھے۔ عدالت میں بھی یہی زبان استعمال ہوتی تھی۔ چنانچہ انگریزوں کے نئے اور باہر سے آئے ہوئے انگریز ملازموں کے لیے فارسی کی تعلیم حاصل کرنا بہت ضروری تھا۔

اس وقت شمالی ہند میں خاص طور پر اور باقی ہندوستان میں عام طور پر فارسی زبان کا ہی رواج تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اگر ہم اس دور پر نظر ڈالیں تو ہم دیکھیں گے کہ

اندر ہی اندر مغلیہ سلطنت کی بنیادیں بڑی سرعت سے کھوکھلی ہوتی جا رہی تھیں اور اس کے ساتھ ہی ساتھ فارسی زبان کو بھی زوال آ رہا تھا۔ دوسری طرف انگریز بھی اپنے قدم جمانے لگے تھے۔ فارسی کی جگہ اردو زبان ملک کی اور مستقبل کی نمائندہ زبان ہو کر ابھرنے لگی تھی۔ چنانچہ اس حقیقت کو لارڈ ویلزلی کی دوراندیش نظروں اور زیرک دماغ نے محسوس کر لیا۔ اس نے آنے والے دور کی ایک دھندلی سی تصویر میں دیکھ لیا تھا کہ ہندوستان میں اردو زبان ہی فارسی کی جگہ لے گی اور اس ملک میں انگریزوں کے قدم اسی صورت میں جم سکیں گے کہ سیاسی بساط کے ساتھ ساتھ اردو زبان سیکھنے کا کام بھی ہوتا رہے۔

چنانچہ فورٹ ولیم کالج کلکتے میں قائم کر دیا گیا۔ یہاں پہلی بار پورے قواعد و ضابطے کے ساتھ انگریزوں کو اردو میں تعلیم دینے کا آغاز ہوا۔ ایسی کتابیں تصنیف کی گئیں جس میں ہندوستان کی ریاستوں، صوبوں، وہاں کے لوگوں کے رہن سہن کا حال اور دیگر ضروری معلومات درج تھیں۔ یہ کالج ایک بڑا وسیع کالج تھا۔ اس کا دائرہ کار بڑا وسیع تھا یہاں صرف دوسری زبانوں کے اردو میں تراجم ہی نہیں ہوتے تھے بلکہ باہر سے آنے والے انگریز ملازموں کو تاریخ ہند، جغرافیہ، اصول قانون، شرع اسلام اور دھرم شاستر کے ساتھ ساتھ مشرقی علوم و فنون کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ انہیں یہاں سنسکرت، گجراتی، مرہٹی، بنگالی اور اردو پڑھائی جاتی تھی۔ لیکن بعد میں اس کالج کے اخراجات اس قدر بڑھ گئے کہ کمپنی نے اسے مزید رقم دینے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ پھر اس کالج میں صرف زبان سکھانے کا کام ہی ہونے لگا۔ اسی فورٹ ولیم کالج میں اردو کا سب سے پہلا ٹائپ کا چھاپہ خانہ قائم کیا گیا۔

فورٹ ولیم کے چھاپے خانے کے بعد سیرامپور میں پادری مارٹن نے ایک چھاپہ خانہ قائم کیا جس میں اس نے انجیل کے جدید عہد کا ترجمہ یونانی زبان سے اردو میں چھاپا۔ یہ ۱۸۱۴ء کا ذکر ہے۔ اسی شہر یعنی سیرامپور کے مشنری حضرات نے پوری بائبل کا ترجمہ ۱۸۱۶ء سے ۱۸۱۹ء تک مکمل پانچ جلدوں میں شائع کیا۔ لکھنؤ میں غازی الدین حیدر کے زمانے یعنی ۱۸۱۴ء میں ٹائپ کا چھاپہ خانہ قائم ہوا۔

اردو کی پہلی ٹائپ کی کتاب

۱۸۱۴ء میں لکھنؤ میں غازی الدین حیدر کے ٹائپ کے چھاپے خانے میں ہفت قلزم پہلی کتاب طبع ہوئی۔ ویسے اردو کی سب سے پہلی کتاب جو ٹائپ میں چھپی وہ پادری مارٹن کا بائبل کا اردو ترجمہ ہی سمجھا جاتا ہے۔ ہفت قلزم فارسی لغت کی کتاب تھی۔ لیتھو پریس کا سنگی مطبع سب سے پہلے ہندوستان کے شہر کانپور میں ایک انگریز مسٹر آرچر نے کانپور میں جاری کیا یہ ۱۸۳۰ء کا دور تھا۔ ۱۸۳۵ء میں دہلی میں ایک لیتھو کا سنگی مطبع قائم ہوا اور ۱۸۳۶ء میں دہلی سے مولوی محمد باقر (مولانا محمد حسین آزاد کے والد) نے دہلی اردو اخبار جاری کیا۔ یہ اردو زبان کا دوسرا اخبار تھا۔ پہلا اخبار مولوی اکرم علی نے کلکتہ سے ۱۸۱۰ء میں شائع کیا تھا۔ نواب نصیر الدین حیدر نے مسٹر آرچر کو کانپور سے بلا کر لکھنؤ میں سنگی پریس قائم کرایا جس میں سب سے پہلی کتاب شرح الفیہ چھپی ۱۸۲۷ء میں دہلی میں ٹائپ کا پریس لگ گیا۔ اس سال کے بعد ہندوستان بھر میں ہر جگہ لیتھو کے چھاپے خانے کھلنا شروع ہو گئے۔ اخبارات بھی نکلنے لگے۔ آگرہ، میرٹھ، بنارس، بریلی، پنجاب، بمبئی، مدراس وغیرہ میں بڑی کثرت سے پریس لگے اور اخبارات نکلنے لگے۔ ایک اندازے کے مطابق بقول ڈاکٹر حامد حسن قادری ۱۸۴۵ء تک صرف ممالک مغربی شمالی (موجودہ یوپی) دہلی اور پنجاب میں ۲۳ مطبعے تھے اور ان مقامات پر ۲۳ اخبار اردو زبان کے جاری تھے۔ تمام ہندوستان کے اردو اخباروں اور رسالوں کی تعداد پچاس کے قریب تھی اور صرف مغربی شمالی ممالک میں ۱۴۱ کتابیں طبع ہوئی تھیں۔ غدر کے اگلے سال یعنی ۱۸۵۸ء میں مطبع نول کشور قائم ہوا اور اسی سال اس مطبع سے اودھ اخبار جاری ہوا۔ یہ اخبار آئندہ چل کر روزنامہ بن گیا اور ملک کے ممتاز اخباروں میں شمار ہونے لگا۔ مطبع نول کشور کو اس قدر ترقی ہوئی کہ نہ صرف ہندوستان بلکہ سارے ممالک مشرق میں اس کے مقابلے کا اور کوئی چھاپہ خانہ اور مطبع نہ تھا۔

شروع شروع میں اس مطبع میں کتابیں بڑی نفاست کے ساتھ چھاپی جاتی تھیں۔ لیکن بعد میں اس معیار کو پوری طرح برقرار نہ رکھا جا سکا جس کی وجہ سے کانپور میں منشی رحمت اللہ رعد کے مطبع نامی کانپور کو آگے نکلنے کا موقع مل گیا۔ یہ مطبع انیسویں صدی کے اخیر میں قائم ہوا تھا۔ اس پریس نے عرصہ بیس برس تک ادب کی خدمت کی اور پھر منشی رحمت اللہ رعد کے انتقال کے بعد ہی اس پریس کا شیرازہ بکھر گیا۔ قدیم مطابع میں مطبع نولکشور کے علاوہ صوفی قادر علی خان کے مطبع مفید عام آگرہ کو بھی فن طباعت میں بڑی شہرت ملی۔

اب ہم ایک بار پھر فورٹ ولیم کالج کی طرف آتے ہیں۔ انگریزوں نے اس کالج کو ایک خاص مقصد کے تحت قائم کیا تھا جیسا کہ اویس احمد ادیب نے اپنے ایک دل پسند مقالے میں اس بات کا اظہار کیا ہے۔ انگریز اس کالج کے ذریعے اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کے کام کو آگے بڑھانا چاہتا تھا۔ باہر سے انگریزوں کو بلا کر یہاں ایک خاص انداز سے حکمرانی کے اصول سکھائے جانے مقصود تھے۔ اس مقصد کے لیے اس وقت کوئی ایسی کتاب اردو زبان کی نہ تھی جو اس کالج کے نصاب میں شامل کر کے انگریزوں کو پڑھائی جاتی۔ مطبوعہ کتاب کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا قلمی کتابوں میں فضلی کی وہ مجلس یا کربل کتھا اور شاہ صاحبان دہلوی کے تراجم قرآن مجید تھے یا مذہبی کتابیں تھیں۔ یہ کتابیں انگریزی نصاب کے لیے موزوں نہ تھیں۔ ایک کتاب تحسین کی تھی جس کا نام تھا نوطرز مرصع۔ یہ بڑی مشکل اور دقیق کتاب تھی۔ ان کتابوں کے علاوہ جو کتابیں مختلف لوگوں نے لکھیں وہ قلمی تھیں۔ ان کے نسخے بے حد محدود تھے اور پھر ان کے مصنف غیر معروف اور گمنام لوگ تھے یہ کتابیں بھی ایک اعتبار سے دینی اور مذہبی کتابیں تھیں۔ گویا اس وقت تک اردو ادب کی کوئی کتاب نہ تھی۔

جان گلکرائسٹ کو اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ایسی کتابوں کی ضرورت تھی جو مذہبی نہ ہوں بلکہ ایسی کتابیں ہوں جن میں ہندوستان کی کہانیاں ہوں جن میں ہندوستان کے بارے میں پوری پوری معلومات ہوں جو باہر سے آنے والے انگریزوں کے لیے فائدہ مند ہوں اور جنہیں پڑھ کر وہ ہندوستان میں رہنے والوں کے مزاج اور یہاں کے رسم و رواج کو بخوبی جان سکیں۔ چنانچہ جان گلکرائسٹ نے ایک ایسا اردو کا ادب پیدا کر دیا جو نادانستہ طور پر تھا اور اس کی کوشش شعوری نہ تھی۔ یہ سب کچھ اس نے اردو لٹریچر پیدا کرنے کے لیے نہیں کیا تھا بلکہ اپنے خالص سیاسی مقاصد کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے کیا تھا۔ جان گلکرائسٹ فورٹ ولیم کالج کے چار برس تک سربراہ رہے۔ لیکن جس کام کو سر کرنے وہ چلے تھے اسے بعد میں بھی ان کے ماتحت انگریزوں نے جاری رکھا۔ ان کے قائم مقام پرنسپل اس کام کی برابر نگرانی کرتے رہے۔

مسلمانوں کا آخری دَور

برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کے عروج کا سورج سلطنت مغلیہ کے زوال کے ساتھ ہی غروب ہونا شروع ہو گیا تھا۔ جنگ پلاسی کی شکست کے بعد انگریزوں کی ریشہ دوانیاں رنگ لائیں ان کے پنجے اس سرزمین کے اندر تک دھنستے چلے گئے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا شعلہ برصغیر میں مسلمانوں کے جذبہ آزادی و حریت کا آخری شعلہ تھا جسے کچھ اپنوں کی سازشوں

اور غداریوں اور کچھ غیروں کے تشدد نے گل کر دیا۔ انگریزوں نے پورے ہندوستان پر قبضہ کر لیا۔ دلّی کی آخری شمع بجھ گئی۔ سلطنت مغلیہ کا نحیف و نزار بادشاہ، مسلمانوں کی آزادی کا آخری نشان جلا وطن کر دیا گیا اور وہ یہ شعر پڑھتا ہوا رنگون روانہ ہو گیا ؎

کتنا ہے بدنصیب ظفر دفن کے لیے   دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

ابتدائی ادبی ماحول

جس وقت انگریز اس سرزمین پر اپنے قبضے کو مستحکم کرنے میں مصروف تھے اس وقت یہاں کے ادبی ماحول پر ایک انحطاط اور عیش پرستی کی چھاپ لگی نظر آتی ہے فورٹ ولیم کالج کی بنیادیں اس لیے کھڑی کی گئی تھیں کہ ہندوستان میں انگریزی راج کی بنیادیں مضبوط کی جائیں۔ یہ کچھ آشوب زمانہ تھا شاہی درباروں پر زوال آ چکا تھا۔ اہل دانش کی بے قدری تھی۔ چنانچہ جان گلکرائسٹ بہت جلد اچھے اچھے انشا پردازوں اور شاعروں کی خدمات حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اگرچہ انہیں کالج کے دوسرے انگریز پروفیسروں کی نسبت بڑا حقیر نذرانہ ملتا تھا۔ مسلمان انشا پردازوں کو اردو کو فارسی عربی کے اثرات سے پاک کرنے پر لگا دیا اور ہندو انشا پردازوں کو سنسکرت آمیز زبان لکھنے کی طرف آمادہ کیا۔ اور یوں اس طرح کا ادب پیدا کیا جو ہندو مسلم جھگڑے کا باعث بن گیا۔ عام فہم زبان بقول اویس احمد ادیب علمی اور سیاسی ضرورت کی وجہ سے پسند کی گئی۔ افسانے انگریزوں کو ہندوستانی زندگی کے رسم و رواج سمجھانے کے لیے ترجمہ کیے گئے۔ وہاں ایسا ادب پیدا کیا گیا۔ جو خود غرضی اور فرنگی قومی مفاد پر مبنی تھا۔

اس وقت تک ہندوستان کے مختلف گوشوں میں فارسی کے اثرات موجود تھے خطوط زیادہ تر فارسی میں لکھے جاتے تھے۔ گفتگو میں فارسی محاورات اور الفاظ کو جگہ دی جاتی نثری تحریروں میں بھی فارسی کا غلبہ ہوتا۔ رسی ضرور جل چکی تھی مگر اس کے بل ابھی باقی تھے۔ یہ اثرات علمی ادبی اور انفرادی کاوشوں میں بھی نمایاں رہے۔ سودا کی نثر سے لے کر تحسین کی نوطرز مرصع تک زبان بالکل فارسی اثرات کے تحت تھی۔ محاورات ضرب الامثال، الفاظ تقریباً فارسی کے تھے۔ اکثر مقامات پر عربی کے محاوروں اور جملوں کو بھی جگہ دی گئی تھی۔ فورٹ ولیم کالج کے زمانے میں بھی دوسرے مقامات کے اہل قلم وہی مقفیٰ اور مسجع عبارت لکھتے رہے۔ محمد حسین کلیم دہلوی، مولوی کریم الدین، مولوی محمد عطا اور مولوی محمد خالق اکبر آبادی کی تصانیف اور تراجم اس کے مظاہر ہیں مگر انشا اللہ خاں انشا نے "رانی کیتکی اور کنور اودھے بھان" کی کہانی خالص آسان ہندی زبان میں لکھی۔

اس وقت تک کی نثر میں لکھنؤ سکول کی کارکردگی نمایاں طور پر دکھائی نہیں دیتی۔ وہاں گھر گھر شعر و شاعری کا چرچا ضرور تھا۔ بچہ بچہ شعر کہتا تھا اور ایک ایک شاعر کے سینکڑوں شاگرد شاعر تھے۔ حکومت بھی شعر و شاعری کی قدردان تھی۔ غزلوں، قصیدوں پر بڑے بڑے خطاب دیئے جاتے۔ بڑی بڑی جاگیریں عطا کی جاتیں مگر نثر کی نہ تو کوئی قدر تھی اور نہ کسی صلے کے ملنے کی امید تھی اور نہ ہی نثر نگار کی حوصلہ افزائی کی گنجائش ہی تھی۔ اویس احمد ادیب لکھتے ہیں کہ "اول تو یہ تنگ نظری تھی کہ شاہان اودھ نے شاعری کے سوا اور کسی صنفِ ادب کو نہ سراہا اور نہ ان کے علمبرداروں کی ہمت بڑھائی۔ اگر اس کو وضع داری کہا جائے تو وہ اس الزام سے بری نہیں ہو سکتے کہ وہ محض نظم میں خوشامد اور خود ستائی پسند تھے۔ نثر میں ایسا نہیں ہوتا تھا۔ اگر اسے صرف عقیدت کہہ دیا جائے تب بھی چھٹکارا نہیں ہوتا۔ بزرگوں کی تقلید کہہ کر یہ ذمے داری دور نہیں کی جا سکتی۔

یہ زمانہ نثر کے لیے بے حد ہلاکت خیز زمانہ تھا۔ لیکن مرزا رجب علی بیگ سرور نے فسانۂ عجائب لکھ کر یہ ثابت کر دیا کہ اردو نثر میں اتنی طاقت ہے کہ شاہی سرپرستی سے محروم ہو کر بھی اپنے لیے ادب میں ایک لافانی مقام حاصل کر سکے اس ناموافق فضا میں فسانۂ عجائب کا وجود میں آنا بذاتِ خود ایک کارنامہ ہے۔ ایک کرامت ہے۔ ممکن ہے بعض یہ کہیں کہ سرور سلطنت اودھ سے متعلق تھے۔ لیکن یہ یاد رہے کہ وہ واجد علی کے عہد میں بحیثیت ایک شاعر دربار اودھ سے کل پچاس روپے ماہوار وظیفہ پاتے تھے اور اس سے پہلے وہ غازی الدین حیدر کے غضب کا شکار ہو کر لکھنؤ چھوڑ کر کانپور میں اپنی زندگی بسر کرنے پر مجبور کیے گئے تھے۔ زمانے کے ہاتھوں وہ بھی بہت پریشان ہوئے۔ نواب غازی الدین حیدر کی ناراضگی کے بعد انہیں جلا وطن کر دیا گیا۔ لکھنؤ چھوڑ کر کانپور آ گئے اور اسی شہر میں انہوں نے حکیم سید اسد علی کے مشورے سے فسانۂ عجائب لکھی۔ جیسا کہ خود انہوں نے سبب تحریر لکھا ہے۔ کتاب کے مقدمے میں لکھتے ہیں۔

"۔ ربیع الثانی کے مہینے میں کہ سن ہجری نبوی صلی اللہ علیہ وسلم بارہ سے چالیس تھے آنے کا اتفاق مجبور کو کانپور ہوا۔ بلکہ یہ بستی لچر لوچ ہے۔ اشراف یہاں عنقا صفت ناپید ہیں۔ احیاناً جو ہوں گے وہ گوشہ نشین ہیں۔ مگر چھوٹی آنت کی بڑی کثرت تھی۔ یہ طور دیکھ کر دل وحشت منزل بہت گھبرایا۔ کلیجہ منہ کو آیا۔ قریب تھا جنوں ہو جائے۔"

فسانۂ عجائب ۱۸۲۴ء کو لکھی گئی۔ باغ و بہار اس سے ۲۲ برس قبل لکھی جا چکی تھی۔ اس کتاب میں سرور نے باغ و بہار کی زبان کو ناقص زبان کی حیثیت سے یاد کیا ہے نواب غازی الدین حیدر کی شان میں قصیدہ لکھا اور اسی کتاب میں شامل کر دیا۔ ۱۸۴۷ء میں واجد علی شاہ کے دربار سے منسلک ہوئے اور ان کے درباری شاعر قرار پائے۔ پچاس روپے ماہوار مشاہرہ مقرر ہوا۔ ۱۸۵۴ء میں شمشیر خانی کا ترجمہ سرور نے نواب واجد علی شاہ کے حکم سے اردو میں کیا اور اس کا نام سرور سلطانی رکھا۔ اس کے بعد سرور زیادہ طوالت کے ساتھ نہیں بلکہ کسی قدر اختصار کے ساتھ افسانے اور قصے لکھتے رہے۔ ان قصوں کہانیوں میں "شرر عشق" خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ جو نواب سکندر بیگم والی بھوپال کے حکم سے لکھی گئی تھی "شگوفہ محبت" بھی سرور نے نواب امجد علی خاں رئیس سندیلہ کی خواہش پر لکھی۔ اس سے قبل یہی قصہ مہر چند کھتری نے لکھا تھا ۱۸۵۶ء میں سلطنت اودھ حکومت انگلیشیہ میں شامل کر لی گئی۔ اور نواب واجد علی شاہ نظر بند کر کے مٹیا برج کلکتہ روانہ کر دیئے گئے۔ سرور بھی حکومت کی اس پریشان حالی اور انقلاب سے پریشان ہو گئے۔ اب ان کی زندگی بے سروسامانی سے بسر ہونے لگی۔ مگر ۱۸۵۹ء میں بنارس کے راجہ نے انہیں اپنے پاس بلا لیا۔ مہاراجہ پٹیالہ نے از رہِ قدردانی طلائی کڑے سرور کی نذر کیے۔ سرور نے اپنے مکتوبات میں دلّی، میرٹھ اور راجپوتانے کے سفر کا خاص طور پر تذکرہ کیا ہے۔ آخری عمر میں سرور کی بینائی میں فرق پیدا ہو گیا تھا۔ اس کے علاج کی غرض سے وہ کلکتہ بھی گئے۔ وہاں انہیں اپنے محسن نواب واجد علی شاہ سے ملنے کا اتفاق بھی ہوا۔ واپسی پر سرور بنارس گئے اور ۱۸۶۷ء میں انتقال کر گئے۔

فسانۂ عجائب سرور کی تصنیف ہے یا ترجمہ؟ اس سے بحث نہیں کیونکہ اردو زبان و ادب کی تاریخ میں اس کتاب کو تصنیف ہی بتایا گیا ہے۔ یہ ترجمہ اس لیے بھی نہیں کہا جا سکتا کہ سرور نے اسے عربی یا فارسی کی کسی کتاب سے ترجمہ نہیں کیا اگر انہوں نے ایسا کیا ہوتا تو وہ وجہ ضرور بیان کرتے۔ بہر حال یہ کتاب اردو زبان اور نثر کی ایک قابل قدر کتاب ہے اور اس نے اردو نثر کے قافلے کو کامیابی اور کامرانی کے ساتھ اپنے سفر پہ گامزن کیا۔

اردو زبان و ادب کے مکمل سلسلہ وار تاریخی جائزے اور تفصیلی تجزیے کا ہم نے جو سلسلہ شروع کیا ہے اس کی پہلی کڑی یہاں آ کر ختم ہوتی ہے۔ اس کتاب میں ہم نے مستند اور صحت مند حوالوں کے ساتھ برصغیر پاک و ہند میں اردو نثر کی پوری ابتدائی تاریخ مکمل سیاسی، سماجی اور ادبی پس منظر کے ساتھ بیان کی ہے انشاء اللہ اس سلسلے کی دوسری کتاب میں ہم اردو کی ابتدا سے لے کر دورِ جدید تک نثر نگاروں، نثری شہ پاروں اور اردو کے نثری ورثے کا اجمالی جائزہ لیں گے۔

جن کتابوں سے مدد لی گئی

(تاریخ نثر)

داستان تاریخ اردو	حامد حسن قادری
مذہب اور شاعری	ڈاکٹر اعجاز حسین
داستان سے افسانے تک	وقار عظیم
تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاک و ہند چھٹی جلد (اردو ادب)	پنجاب یونیورسٹی لاہور
تنقیدی مطالعے	اویس احمد ادیب
دکن میں اردو	نصیر الدین ہاشمی
اردو شہ پارے	ڈاکٹر محی الدین زور
گلکرسٹ اور اس کا عہد	عتیق صدیقی

اُردو شعر کا ایک مستند تاریخی و اَدبی سلسلہ

اُردو شعر کی پہلی کونپل بارھویں صدی عیسوی میں کوہ ہمالیہ کی سرسبز وادی میں پھوٹی۔ دکن کے معروف شعراء اور بزرگانِ دین نے اسے پروان چڑھایا اور پھر اس کی مہک گولکنڈہ، بیجاپور، احمد نگر اور گجرات کے ساحلوں تک کو مشکبار کرتی، دہلی، لکھنؤ اور پنجاب کے شعری دبستانوں میں اپنے اوجِ کمال تک پہنچی۔

اُردو شعر کی مکمل تاریخ جاننے کے لیے روشن کتابوں کے نئے اَدبی سلسلے

اُردو شعر کی داستان

کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔

مؤلف: اے۔حمید

قیمت صرف تین روپے

ہر ماہ
کی
۲۰
تاریخ
کو
اپنے
قریبی
بکسٹال/ہاکر
سے
طلب
فرمائیں!

روشن کتابیں

مطبوعات شیخ غلام علی ادبی مارکیٹ چوک انارکلی، لاہور